کیا خدا ہے؟
toobaa-elibrary.blogspot.com
حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب مدظلہم
مکتبہ دارالعلوم کراچی
29
Acc

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا خدا ہے؟

عبدالحکیم سکھروی

ملنے کا پتہ
مکتبہ دارالعلوم کراچی

نوجوان نسل کے نام

(مشہور آفسٹ پریس کراچی ۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حصۂ اوّل

کیا خدا ہے؟

باب ا

نہر کے پار ایک بلڈنگ کے سامنے باغیچے کے دروازے کے قریب مالی بیٹھا ہوا حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُسے دیکھ کر نجانے کیوں پہلی بار دل نے چاہا کہ اُس سے گفتگو کی جائے۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ نسیمِ صبح اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ پودوں اور پھولوں پر پڑی ہوئی شبنم موتیوں کی لڑی کی طرح معلوم ہو رہی تھی باغ کی طرف جانے والی سڑک کا عجیب دلکش و دلربا نظارہ تھا۔ بنانے والوں نے کچھ ایسی خوبی سے اُسے بنایا تھا کہ دیکھ کر بے ساختہ منہ سے داد نکل رہی تھی۔

شیشے جیسا ڈامر، دورویہ فٹ پاتھ پر سُرخ بجری اور دونوں جانب برابر برابر درختوں کی قطاریں سامنے بہتی ہوئی صاف و شفاف نہر اور نہر کے کنارے نئے فیشن کی کوٹھیاں، ایسا عجیب طرزِ انداز کہ کاریگروں کے ہاتھ چوم لینے کو دل چاہے، دیکھنے والے تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے، کوٹھیوں کے سامنے باغیچے، باغیچوں کے درمیان حوض اور ہر حوض سے سانپ کی طرح لہراتی بل کھاتی اور آفتاب کی کرنوں کے رنگا رنگ روپ دکھاتی ہوئی نہر بہتی چلی جارہی تھی۔ کوٹھیاں بڑی کثرت سے تھیں مگر آمدورفت کم تھی۔ یا تو دو ایک چہل قدمی کرنے والے ادھر گھوم رہے تھے یا کبھی کبھی کوئی کار تیزی سے گزر جاتی تھی۔ اس پرسکون اور حسین و جمیل منظر کو دیکھ کر یہ کہنا ہی پڑتا تھا کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ٭ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

دل ہی دل میں ہم سوچ رہے تھے کہ یہ عالیشان کوٹھیاں، یہ باغ و بہار یہ پھول پھلواری، یہ نہر اور حوضوں کے فوارے، یہ دالان اور ان کے ستون یہ کھڑکیاں، اور دریچے، کاریگروں نے خوب بنائی ہیں۔ ایک دفعہ سُنا تھا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک دنیا کے گلشن کا کوئی باغباں ہی نہیں سمجھتے ہیں کہ ساری کی ساری دنیا خود بخود بن گئی ہے۔ اس کا بنانے والا کوئی ہے ہی نہیں، ہمارے ذہن میں یہی باتیں گھوم رہی تھیں کہ مالی نظر پڑا اور ہم خراماں خراماں چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔

پھولوں سے دماغ پہلے ہی معطّر ہو چکا تھا۔ ایک طرف چنبیلی کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو مہک کر بکھری ہوئی تھی۔ دوسری طرف گلاب کے

سبز پھول پٹری کے کنارے لدے کھڑے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ان کو ہلا اور گدگدا رہے تھے۔ ایک جانب سے چنبیلی کا عطر پیش کیا جا رہا تھا تو دوسری جانب سے گلاب کا عطر۔ سامنے سرس کے بوڑھی عورت کے سفید بالوں جیسے پھول کھلے ہوئے تھے، ان کی خوشبو کا بیان کرتے ہوئے عقل حیران ہو جاتی ہے اس وقت بھی ہمیں اپنی عقل کی بے عقلی پر ہنسی آنے لگی کیونکہ بعض دفعہ تو یہ معمولی معمولی باتوں میں حیران ہونے لگتی ہے۔ کتنا ہی سوچو مگر عقل کام نہیں کرتی۔ بس یہ حقیقت ہے اُس عقل کی جسے ہم ہر بات اور ہر کام میں لانا چاہتے ہیں۔ اُس نے تو یہیں ہتھیار ڈال دیئے کہ نہ معلوم پھول میں یہ خوشبو کس نے بسائی۔ چنبیلی میں گلاب کی خوشبو کیوں نہیں آتی چنبیلی کے پھول سفید ہی کیوں ہیں گلاب کی طرح سُرخ کیوں نہیں؟ آخر ان سب پھولوں کی نشو ونما ایک ہی زمین سے ہوئی ہے۔ خود بخود تیار ہو جانے والی چیزوں کو یہ ڈھنگ کہاں سے آ گیا کہ اصول اور ضابطے کے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ مالی نے ہمیں خیالات کے سمندر میں ڈوبا ہوا پایا تو مسکرا کر بولا، "کیا بات ہے میاں؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

مالی کے خطاب پر ہم چونکے۔ دل پر ہلکا سا غبار آ گیا تھا اور یہ نتیجہ تھا غلط لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا۔ سوچا کہ مالی کی گفتگو سے شاید یہ غبار صاف ہو جائے۔ اس وقت دونوں کا دماغ حاضر ہے۔ ہوا پھولوں کو چھیڑ رہی ہے۔ پھر کیوں نہ ہم بھی مالی کو چھیڑیں، ذہن میں عجیب سا نکتہ آیا وہ یہ کہ چھیڑنے والے کے بغیر بھی کبھی چھیڑ خانی ممکن ہے، کیا ایسا ممکن ہے کہ چھیڑ تو ہو مگر چھیڑنے والا کوئی

نہ ہو ــــ ہم نے مالی کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور پوچھا،
کیوں بھائی یہ باغیچہ کہاں سے لائے ہو؟

ہمارے سوال پر مالی اُچھل پڑا۔ بوکھلا کر بولا "میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں"

"ارے، اتنی معمولی سی بات نہیں سمجھتے!" ہم نے کہا: ہم یہ پوچھ رہے ہیں کہ یہ باغیچہ، باغیچے کے یہ پھول اور پھلواریاں، پھولوں کے تختے اور کیاریاں ان کا دلفریب طرزِ انداز۔ ان کی دلکش کانٹ چھانٹ اور سبز مخمل کا یہ فرش کس بازار سے ملتا ہے؟"

مالی نے سر سے پاؤں تک ہمیں اس طرح دیکھا جیسے اُسے شبہ ہو کہ کہیں ہم پاگل تو نہیں ہو گئے منہ بنا کر کہنے لگا "کیوں مذاق کرتے ہو میاں؟ بھلا یہ چیزیں بازار سے ملتی ہیں؟"

"اگر یہ چیزیں بازار سے نہیں ملتیں تو خود بخود یہاں کیسے آگئیں اور یہ پودے آپ ہی آپ اس عمدہ طرزِ انداز اور سلیقہ کے کس طرح اُگ آئے۔ یہ نہر، نالیاں، روشیں اور ان کی تہذیب خود بخود کیسے ہو گئی۔ یہ پودے کہیں سے اُڑ کر آئے ہیں یا زمین کے اس خطّہ سے نکل کر خود بخود قطار در قطار لگ گئے ہیں؟ یہ فوارے کس خوبی کے ساتھ آپ ہی آپ نکل آئے ہیں ــــ کمال ہے بھائی اتنا بڑا باغیچہ کسی بازار میں ملنے کے بجائے خود بخود وجود میں آگیا ہے۔"

"میاں آپ ہوش میں ہیں یا نہیں۔" اپنے ہاتھ کی کھرپی زمین پہ

ڈال کر وہ ہمارا چہرہ تکتا ہوا بولا: "آپ نے تو میری ساری محنت خاک میں ملا دی، میں سمجھا تھا کہ آپ میرے کام کی داد دیں گے میری تعریف کریں گے۔ مگر آپ کے دو جملوں نے میری بیس سال کی محنت ایک لمحہ میں ملیامیٹ کر ڈالی۔" پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہنے لگا۔ "جناب۔ میں۔ میں اس سوسن کو نواب آصف الدولہ کے بنگلے سے بڑی خوشامد درآمد کے بعد لایا، اس کو لگایا، دیکھ بھال کی۔ اور جناب، گلاب کی اس روش پر پندرہ سال سے خون پسینہ ایک کر رہا ہوں۔ کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہوں۔ یہاں کا ہر پودا اور ہر درخت خوب سوچ سمجھ کر لگایا گیا ہے۔ ایک ایک کیاری کو میں نے ناپ ناپ کر بنایا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے بیج بوئے ہیں اور اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی ہے۔"

ہم نے مسکرا کر کہا: "اوہو، تم تو بڑی خوبیوں کے مالک ہو۔ ہمیں تو آج ہی معلوم ہوا کہ پودے درخت خود بخود نہیں اُگتے بلکہ انھیں تم اُگاتے ہو اور بڑھاتے ہو۔"

وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولا۔ "پودے کی دیکھ بھال، لگانا، بیج بونا، پانی دینا، قطاریں لگانا میرا کام ہے، لیکن اُن کو اُگانا اور بڑھانا میرے بس میں نہیں۔ یہ تو کسی ایسے کاریگر کا کام ہے جسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں، خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کاریگر کے بغیر کاریگری نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اسی کوٹھی کو لے لیجئے۔

ہم نے کہا: "تم نے تو ہمارے دل کی بات کہہ دی۔ بھلا یہ اتنی عمدہ

عمارت کہاں سے ٹپک پڑی ہے یا اُسے بھی کسی نے تمہاری طرح بیج ڈال کر اُگایا ہے۔ ایسے دو تین بیج ہمیں بھی دیدو، بڑا کرم ہوگا تمہارا۔"

"بس میاں، بس!" وہ ہمارے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا: "کوٹھی کا کاریگر بہت غصے والا ہے، اگر اُس نے یہ بات سُن لی تو چھوٹتے ہی چانٹا مار دے گا۔ غضب خدا کا، اس نے جان کھپائی، رات دن ایک کر کے بنایا اور آپ نے یہ کہہ کر اسکی ساری محنت کو خاک میں ملا دیا کہ بیج بو کر اُسے اُگالیا ہے۔"

"بھئی ہم تو یہی سمجھ رہے تھے۔" ہم نے ملائمت سے کہا: "پیڑوں، پودوں کی طرح کوٹھیوں کے بھی بیج ہوتے ہوں گے۔ تم کہتے ہو کہ اُن کے بیج نہیں ہوتے، تو چلو تمہاری بات تسلیم کئے لیتے ہیں۔ اچھا ایک کام تو کرو۔ گلاب کا ایک پودا ہمارے ہاتھ پر اور ایک کُرتے پر اُگا دو تاکہ ہر وقت بھینی بھینی مہک آتی رہے یہ کام تو تم کر ہی لیتے ہو، مگر بھائی کوئی چھوٹا سا پودا اُگانا، کبھی چارپائی ہی کو نہ گھیر لے۔

"شاید آپ کو مالیخولیا ہو گیا ہے۔" مالی نے جھنجھلا کر کہا: "روزانہ اس طرف سیر کے لئے آیا کیجئے۔ دماغ صحیح ہو جائے گا۔ بھیجے کی دھول اور مٹی تازہ ہوا کی جھاڑو سے صاف ہو گی۔"

ہم نے اس کی بات سُنی اَن سنی کر دی: "اچھا تو تمہاری باتوں کا مطلب یہ ہوا کہ کوٹھی کسی کاریگر معمار نے بنائی ہے اور پھولوں، پودوں، روشوں اور کیاریوں کے منتظم تم ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چیز ہے تو اس کا بنانے والا بھی ہے۔ مصنوع ہے تو صانع بھی لازمی

ہوگا۔ نظام ہے تو منتظم بھی ہونا چاہیئے ہریالی ہے تو ہرا رنگ بنانے اور بھرنے والا بھی ماننا پڑے گا۔ خوشبو کا پیدا کرنے والا بھی ضرور ہوگا، مصنوعات بغیر صانع کے نہیں، اور انتظام بغیر منتظم کے ناممکن۔ گویا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری تمہاری دنیا بھی خالق کے بغیر خود بخود وجود میں نہیں آگئی، اس کا صانع منتظم اور نگران موجود ہے۔ واہ بھئی۔ ہمارے دل کا غبار تمہاری باتوں سے صاف ہو گیا۔ خدا تمھیں جزائے خیر دے"۔

"وہ بولا۔ "میاں آپ کی طرح بڑی بڑی باتیں تو ہمیں آتی نہیں۔ ہم تو سو کی سیدھی ایک بات جانتے ہیں کہ موٹر کار، ڈرائیور کے بغیر نہیں چل سکتی تو اتنی بڑی دنیا کسی رکھوالے اور پالنہار کے بغیر کیسے چل سکتی ہے۔ سارے کرشمے، ساری چہل پہل اور گہما گہمی ایک ہی ذات کے باعث ہیں"۔

ہم نے دل ہی دل میں مالی کے خیالات کی تعریف کی، موجودہ دور کے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، ترقی پسند لوگوں سے تو یہ جاہل مالی اچھا۔ کم از کم ان لوگوں کی طرح کوتاہ نظر تو نہیں جو معمولی کار کے لئے ڈرائیور کا ہونا ضروری سمجھیں اور وسیع و عریض کائنات کو تخلیق کرنے، رواں دواں رکھنے اور سنبھالنے والی عظیم ہستی کا انکار کریں۔

آئے تو مالی سے چھیڑ خانی کے لئے تھے لیکن واپس ہوئے تو یہ سوچتے ہوئے کہ ایسے سیدھے ذہین لوگوں کی قدر کرنی چاہیئے۔ یہ ہماری طرح زیادہ قیل و قال نہیں کرتے۔ عبارت آرائی اور پیچیدہ گفتگو انہیں نہیں آتی کسی بات کے نتیجے پر پہنچنے کیلئے زیادہ دماغ نہیں لڑاتے۔ جو چیز نظر کے سامنے آجائے اسی سے سبق اخذ کر لیتے ہیں اور کمال تو یہ ہے کہ عالموں اور دانشوروں کی طرح ٹھوکر نہیں کھاتے۔

باب ۲

باغیچے کی دلربائی دل میں بسی ہوئی تھی۔ رات کو دل ودماغ اسی کی روِشوں میں چکر لگاتے رہے۔ ہم نے بھی ان کو اجازت دے دی کہ عطر بیز جگہ ہے، ہو آؤ کچھ معطّر ہو کر ہی آؤ گے۔ لیکن سوکر اٹھے تو دماغ میں وہ عطر موجود نہیں تھا اس وقت ہمیں شدّت سے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ محض خواب وخیال سے دماغ کیسے معطّر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تو کوئی عطر بسانے والا ہونے چاہیئے۔ چنانچہ ہمارے ذوق وشوق نے جھنجھوڑا اور ہم نہر کے پار والے باغیچے میں خراماں خراماں سڑک کو عبور کرتے ہوئے جا پہنچے

اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑا شاندار باغیچہ تھا۔ دروازے پر عنابی رنگ کے پھولوں کی بیل ہوا کے جھونکوں سے اس طرح جھوم رہی تھی کہ گویا ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی ہو کہ ہمارے پاس آؤ۔ درختوں کی ٹہنیاں یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ ہم دائیں جانب کے دروازے سے اندر پہنچے۔ سیدھی پختہ سڑک پر دورویہ جامن کے درخت تھے۔ نیچے پڑی ہوئی جامنوں کے رنگ سے زمین نیلی ہو رہی تھی۔ بے دانہ جامن جب طوطا کاٹ کر پھینکتا ہے۔ نیچے گرتے ہی پھٹ جاتی ہے اور بے اختیار

دل چاہتا ہے کہ یہ رس گلہ منہ میں رکھ لیا جائے سوچا کہ گھاس میں ضرور ثابت ملیں گے۔ ایک گھرے سایہ دار درخت کے نیچے پہنچ کر ناشتہ کیا۔ اور قدرتی رس گلے خوب مزے لے لیکر کھائے۔ ایک سے ایک بڑھ کر لذیذ معلوم ہو رہا تھا۔ کھاتے کھاتے پیٹ بھاری ہو گیا۔ ذرا دم لیا اور خیال کیا کہ ایسی لذیذ کھٹاس مٹھاس بھرنا اس درخت کا کام تو معلوم نہیں ہوتا ورنہ ہر موسم میں یہ ایسے ہی پھل دیتا، جڑ، تنے اور پتّوں کا مزہ بھی ایسا ہی ہوتا زمین کا مزہ بھی معلوم اور اور پانی کے مزے سے بھی واقفیت لیکن ایک خاص وقت میں اسی درخت اور زمین اور پانی کے ذریعہ خصوصی ترتیب کے ساتھ مخصوص رنگ اور مزے کا پیدا کرنا اور پھر ختم کر دینا قدرت ہی کا کام ہے۔ مالی یا کسی دوسرے انسان کے بس کا نہیں، اس قسم کا شربت بھی بنانا محال ہے تاوقتیکہ اس میں جامن ہی نہ گھولی جائے۔

یہاں سے آگے بڑھ کر سہ دری میں پہنچے۔ اس کے تینوں اطراف میں چہار گوشہ گنبد تھے اور گنبد سے تقریباً ایک گز کے فاصلے پر چار دیواری اندر رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے۔ کوئی سبز پوشاک میں ملبوس سرخ ٹوپی زیب سر کئے ہوئے تھا، کسی نے سفید عبا پہن رکھی تھی، کہیں زردی مائل سفید پھول مسکرا رہے تھے۔ پودے اپنے پیدا کرنے والے کی تعریف اور شکر کے طور پر بار بار اپنا سر جھکا رہے تھے۔ ایسا عجیب سماں دیکھ کر دل مسرور ہو گیا۔ دائیں جانب سبز گھاس کا پلاٹ تھا۔ پلاٹ کے کنارے بڑھل کا درخت اُگا ہوا تھا جس کے نیچے ایک بنچ پڑی ہوئی تھی۔ ہم قریب پہنچے تو دیکھا ہمارے

کرم فرما شمیم اختر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ہماری تو عید ہو گئی۔ مسکراتے ہوئے اُن کے پاس پہنچے اور سلام کر کے برابر بیٹھ گئے مگر یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ شمیم اختر خلافِ معمول کچھ اُداس اُداس گہرے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ہم نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بھائی! شمیم! غم کی بات کا علاج غم کرنا تو نہیں ہے۔ پریشانی پریشان ہونے سے تو نہیں جایا کرتی۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم بھی آپ کے ساتھ پریشان ہو کر آپ کی پریشانی کو بھگا دیتے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ اس طرح پریشانی نہیں جایا کرتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے، یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ اونٹ کا اونٹ، نہ خود چلے نہ چلنے دے، اسی کو کہتے ہیں۔"

ہماری بات سُنکر شمیم اختر کچھ ہوشیار ہوئے۔ ہماری طرف اُداس نظروں سے دیکھا، ہم نے دل ہی دل میں سوچا پریشانی کا علاج بالضد ہوتا ہے۔ کچھ ہنسو ہنساؤ۔ ان سے دلچسپی کی باتیں کرو۔ تب ہی ان کی پریشانی دور ہو سکے گی۔

وہ بولے: "یہ ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے۔ اونٹ کا اونٹ، نہ خود چلے نہ چلنے دے۔ آخر اس بات کا کیا مطلب ہوا؟"

ہم نے کہا: "کہاوت ہے سنا ہے کہ کسی زمانے میں غدر ہوا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ ایک جنگل میں فوج کے بہت سے سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ کچھ بچ نکلے، ان میں زخمی بھی تھے ایک فوجی کے پیروں پر ویسے زخم آئے کہ چلنے پھرنے سے عاجز ہو گیا۔ صبح سے شام ہونے کو آئی

کوئی ایسا نہیں جو اُن کی مدد کرے۔ شام کے وقت ایک لالہ جی ادھر سے گذرے، بنیئے تو لالچی ہوتے ہیں ہی۔ فوجی نے انھیں آواز دی۔" لالہ جی! ادھر آؤ۔"

پہلے تو وہ ٹھٹکے، مگر فوجی کو زخمی دیکھ کر ہمّت بندھی۔ دور ہی سے پوچھا: "کیوں بھئی کیا بات ہے؟" ـــ فوجی نے کہا "میری کمر میں ہمیانی بندھی ہوئی ہے۔ اس میں اشرفیاں ہیں۔ اب میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے۔ چند گھنٹوں کا مہمان ہوں، کھول کر لے لو تو تمھارے کام آجائیں گی ورنہ خدا جانے کس کے ہاتھ لگیں۔"

بنیئے نے اچھا موقع دیکھا۔ مفت کی دولت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ یہ بھی خیال نہ کیا کہ آخر اس فوجی کو مجھ سے بغیر کسی جان پہچان کے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ لپک کے ہمیانی کھولنے بڑھے۔ فوجی نے تلوار نکال کر ان کے پیروں پر وار کیا اور بولا: "بیٹھ جاؤ لالہ جی۔ اکیلے رات کٹنا مشکل ہے، ہم نے سوچا کہ دو ہوں گے تو بات کرتے کرتے آسانی سے رات گزر جائے گی۔ ہمیانی میں کچھ نہیں ہے۔"

بنیا آہ بھر کر بولا: "اوت کا اوت۔ نہ خود چلے نہ چلنے دے۔"

یہ قصّہ سُن کر شمیم اختر خوب ہنسے۔ کہنے لگے: "سچ ہے لالچ بُری بلا ہے۔ لالچی کو ہمیشہ ذلّت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور دل فقیر ہی رہتا ہے۔ فائدہ کی ذرا سی بات وہم میں آجائے اور پھر کوئی فائدہ نہ ہو تو پچھتانا رہتا ہے۔

آپ کی کہاوت پر ایک حکایت ہمیں بھی یاد آگئی۔

"ایک بنیا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ کسی شخص سے سُود لینے پر جھگڑا ہو رہا ہے بنیا کہتا ہے۔ "بیس روپے لوں گا" وہ شخص ضد کر رہا ہے: "اس وقت تو دس روپے ہی دوں گا" اسی بحث مباحثہ میں بنیئے کی آنکھ کھل گئی۔ سمجھا کہ لو وہ دس بھی گئے۔ جلدی سے آنکھیں بند کر کے بولا "لاؤ۔ دس ہی دیدو۔"

اور ہاں۔ ایک بساطی کا قصّہ اور یاد آگیا۔ وہ بھی بڑا لالچی شخص تھا۔ محلہ کے بچے اس کو چھیڑتے تو پتھر مارتا۔ ایک دفعہ بچّوں سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے اُس نے یوں ہی جھوٹ موٹ کہا۔ "ارے، تم لوگ یہاں گھوم رہے ہو اور وہاں برابر کے محلّے میں بسکٹ بٹ رہے ہیں۔"

بچّے یہ سُنکر بسکٹوں کے لالچ میں بھاگے تو انھیں بھاگتے دیکھ کر بساطی خود بھی اپنے جھوٹ پر یقین کر کے ان کے پیچھے بھاگنے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بسکٹوں سے محروم رہ جاؤں۔"

اس طرح کچھ دیر ہنسی دل لگی کی باتیں ہوئیں تو شمیم اختر کی طبیعت سنبھل گئی اور ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے روانہ ہوئے ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کے غم و افسوس کے بارے میں کچھ پوچھ کر ان کا رنج تازہ کریں۔ انشاءاللہ کل پوچھ لیں گے ۔۔ اتنی بات البتہ سمجھ میں آئی کہ کوئی بھی شخص ایسا کام کرنا نہیں چاہتا جس کے بعد اُسے پچھتانا اور افسوس کرنا پڑے۔ مگر پھر بھی کوئی اُسے کام کرا دیتا ہے جس میں انسان کی اپنی مرضی اور رائے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ یقیناً

کوئی طاقت ایسی موجود ہے جو انسانی عزائم اور ارادوں کو اپنے تابع رکھتی ہے،
بڑے بڑے عقلمندوں، حکیموں اور فلاسفروں کی تمنّائیں اور مرادیں پوری نہیں
ہوتیں حالانکہ انھیں اپنی عقل اور تدبیر پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے ہر انسان
کی زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے، اور چاروں
طرف سے ناامید ہو کر کہہ اٹھتا ہے کہ کیا کروں۔ اور بعض اوقات انسان کا ارادہ
اور گمان بھی نہیں ہوتا اور مقصود پورا ہو جاتا ہے۔ کوئی طاقت، انسانی طاقت
سے بڑھ کر ضرور ہے جو انسان کے عزم و ارادے کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اور انسان
نہیں چاہتا پھر بھی اس کا کام ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو افسوس اور خوشی
کا محل بھی انسان نہیں ہوتا۔ خوشی اور غم ہے تو اس کا خالق بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔
بغیر تسلیم کئے چارہ نہیں۔ اس قادرِ مطلق اور خالقِ کائنات کو ہم مسلمان خدائے
تعالیٰ کہتے ہیں۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ساری کائنات کی بھاگ ڈور ہے
اسکی عظیم ذات کے ماننے میں کیا استحالہ لازم آتا ہے جو مادّہ پرست دہریئے
اُس کے وجود سے انکاری ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں۔
ایک فطری امر ہے۔ فطری بات کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے تو وہی انکار
کر سکتا ہے جو ناسمجھ، بے عقل اور بدطینت ہو۔

****

باب ۳
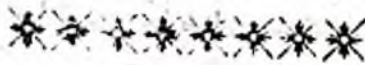
انسان وہی ہے جو دوسرے انسان کے ساتھ ہمدردی کرے، دکھ درد میں کام آئے وہ بھی کوئی انسان ہے جو دوسروں کو ستائے، ایذا دے اور ظلم کرے مگر ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے. یہاں بھلے بھی ہیں اور بُرے بھی نیک معاش بھی اور بدمعاش بھی ایسے آدمی بھی ہماری نظروں سے گذرے جو دوسروں کے ساتھ ہمدردی، بھلائی اور خیر خواہی، حُسنِ سلوک اور امداد وغیرہ دل کھول کر کرتے رہے مگر دنیا میں انھیں صلہ نہ ملا۔ ایسے بدکردار بھی دیکھے جنھیں کبھی ان کے ظلم کی سزا نہ ملی۔ وہ یونہی عیش پرستی کرتے کرتے مر گئے۔

عقل کہتی ہے کہ احسان پرستی کرنے والوں کو اس کا صلہ ملے لیکن نہیں ملا۔ ظالموں کو اُن کے مظالم کی سزا ملنا چاہیئے مگر وہ پھولے پھلے۔ اُن کو سزا نہیں ہوئی چنانچہ ایک ایسا جہان ماننا پڑے گا اور ایک خالقِ کائنات کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ جو مرنے کے بعد محسنوں کو احسان کا بدلہ دے اور انعام و اکرام سے نوازے تاکہ وہ اپنے کیئے پر خوش ہوں۔ یہ خلافِ عقل ہے کہ مزدور کو مزدوری نہ ملے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خالقِ کُل ان ظالموں کو ان کے مظالم پر سزا دے جو عمر

بھر غریبوں کو ستاتے اور اُن کا خون چوستے رہے۔ یہاں تو ان کو کسی نے نہ پکڑا اور وہ متعدد مظلوموں اور بے گناہوں کو ستا کر، خون چوس کر بلکہ مار کر ختم ہو گئے انصاف کا تقاضا اور عقل سلیم کا فیصلہ یہی ہے کہ روزِ جزا قائم ہو تاکہ ہر ایک کو اپنے کئے کا بدلہ ملے۔ بدلہ لینے والے، حساب کرنے والے اور فیصلہ کرنے والے کو ماننے بغیر چارہ نہیں۔ بغیر کسی شک و شبہ کے وہ اب بھی موجود ہے، اگر موجود نہ ہو تو اُسے یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس نے کیا کیا ہے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ سے موجود رہے گا۔ اسی ذات کو ہم خدا کہتے ہیں اس میں ایسا کونسا عقلی پھیر ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تو خود عقل کا تقاضہ ہے کہ اس کو مانیں اور یقین کریں۔

اگلے روز اسی قسم کی باتیں سوچتے اور ٹھنڈی سڑک کی عطر بیز ہوا کھاتے ہوئے باغیچے میں پہنچے۔ شمیم اختر سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا جس کا ایفا کرنا ضروری تھا۔ لیکن اگر وعدہ ایفا نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جو یہ کہتا ہو کہ ملاقات کا وعدہ کر کے پورا نہ کرنے پر کسی قسم کی سزا دی جائے گی۔ خلافِ وعدہ کام کرنے پر دنیاوی لحاظ سے پکڑ دھکڑ کا کوئی خوف نہیں۔ دن بھر میں پچاسیوں وعدے کر لو۔ ذرا سی زبان ہی تو ہلانا ہے کوئی مجسٹریٹ یا جج یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ چونکہ تم نے اپنے وعدوں کا پاس نہیں کیا اور خواہ مخواہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو زحمتِ انتظار میں مبتلا کیا۔ اس لئے تمھیں اتنے سال یا اتنے مہینے یا اتنے دن کے لئے قید بامشقت کی سزا دی جاتی ہے، اس اطمینان کے باوجود یہ بے چینی اور گھبراہٹ کیوں ہے؟ دل کیوں چاہتا ہے کہ وعدہ کیا ہے تو اُسے نبھانا بھی ضروری ہے؟ یقیناً کسی نہ کسی کا خوف ضرور ہے۔ لازمی طور پر پکڑے جانے کا خطرہ لاحق ہے۔

اسی پکڑے جانے اور دار و گیر ہونے کے خیال کو حساب قیامت سے تعبیر کرتے ہیں یہی خیال روکتا ہے کہ خلافِ وعدہ نہ کرو، ورنہ یوم حساب کو کیا جواب دوگے؟ حساب اور یوم حساب مان لیا تو مالکِ یومِ حساب بھی ماننا پڑے گا۔ جس طرح کتابت بغیر کاتب کے اور بادل بغیر بارش کے اور چاندنی بغیر چاند کے نہیں ہو سکتی، اسیطرح حساب بغیر حساب لینے والے کے نہ لیا جا سکتا ہے اور نہ دیا جا سکتا ہے یہ کہنا کہ حساب لینے والا کوئی نہیں ہے بالکل ہی خلاف عقل ہے۔ حساب دینا ہے تو حساب لینے والے کو ماننا عقل و فہم کے مطابق ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ خلاف وعدہ کام کرنے پر سزا کی کیا ضرورت ہے۔ تو اس کا جواب عقلِ سلیم یہ دیتی ہے کہ وعدہ ایفا نہ کرنے سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایک شخص دوسرے کو ایذا پہنچائے اور ایذا پہنچانے والے کو کوئی دار و گیر نہ ہو تو یہ بات انصاف کے خلاف ہے۔ جان بوجھ کر ایذاء پہنچانے والے کو سزا ملنی چاہیئے ۔ مگر انصاف کرنے والا ایسا ہو جسے سب خفیہ باتوں کی خبر ہو۔ جسے ڈھکے چھپے، ظاہر و باطن کے وہ جرائم معلوم ہوں جن کا اس دنیا میں نہ انسان دعوٰی کر سکے اور نہ کسی سے انصاف کے لئے کہہ سکے۔ بے شمار ایسے خفیہ جرم ہیں جن کا اس دنیا کی کسی عدالت میں دعوٰی نہیں کیا جا سکتا لیکن عقل چاہتی ہے کہ ان خفیہ جرموں کا بھی فیصلہ ہو۔ فیصلہ ہوگا تو فیصلہ کرنے والا بھی ضرور ہوگا۔ جو نہیں مانتے وہ خلافِ عقل باتیں بناتے ہیں۔ اور محض وہم و گمان اور تخمین و ظن سے باتیں کرتے ہیں جو ھرگز ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔

شمیم اختر صاحب حسبِ توقع ہمارے منتظر تھے۔ آج وہ مغموم نظر

نہیں آرہے تھے۔ ان کے چہرے سے غم کے بادل چھٹ چکے تھے۔ ان کا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ انسان اپنے فعل کا مختار نہیں ہو سکتا۔ وہ چاہے تو کہ خود ہی اپنا غم دور کرے تو نہیں کر سکتا۔ اسی طرح چاہے کہ بیٹھے بیٹھے غمگین ہو جائے تو غمگین بھی نہیں ہو سکتا۔ جب اپنے اوپر غم طاری کرنا یا اپنا غم دور کرنا انسان کے اختیار میں نہیں تو اس کو مختار سمجھنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ غم کا پیدا کرنا اور دور کرنا انسان کے قابو سے باہر ہے تو اس کو ایسی ذات مان لینا چاہیئے جس کے حکم سے یہ پیدا ہو اور جس کے اشارے پر کافور ہو جائے۔

ہم اور شمیم اختر باغیچہ میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے ایک بینچ پر جا بیٹھے سہانا وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کی چوٹیوں پر سورج اپنی زرد چادر پھیلا رہا تھا۔ درختوں پر طوطے غول کے غول آ بیٹھے تھے اور مالی نے انھیں بھگانے کے لئے گوپیا سنبھال لیا تھا۔ تیز سینکڑوں کی تعداد میں باغ کی طرف جھک رہے تھے۔ ہم بغور یہ دلچسپ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کہ شمیم اختر نے ہمارے خیالات کے تانے بانے کو یہ کہہ کر توڑ دیا:

"ایک بڑی مزے دار بات یاد آ گئی"۔

"وہ کیا؟"

"ابھی آپ نے کہا تھا کہ انسان اپنے فعل کا مختار نہیں ہے بلکہ ہر کام خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک صاحب سے یہی بات میں نے کہی تھی تو وہ لگے آئیں شائیں بکنے کہ انسان یوں مختار ہے، یوں طاقت والا ہے اور یوں ہر کام انجام دے سکتا ہے۔ خدا کے تصوّر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انسان جو چاہتا ہے

کر لیتا ہے۔ ہر فعل اس کے اختیار میں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کی بکواس کا کیا جواب دوں مگر اچانک حق تعالیٰ نے میرے دل میں ایک بات ڈال دی۔ میں نے کہا کہ اچھا صاحب۔ اگر انسان اپنے ہر فعل کا مختار ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے تو ذرا مہربانی کر کے چھینک کر تو دکھانا۔ چپکے ہی چپکے چھینکنے کی کوشش بھی کی کہ مجھے اپنے مختار کل ہونے کا ثبوت فراہم کر سکیں۔ میں نے چھیڑا: "چھینکو، بھائی۔ یہ تو بہت ہی معمولی سا فعل ہے اور تم اپنے ہر کام پر با اختیار ہو تو چھینکتے کیوں نہیں؟"

کہنے لگے: "یہ تو میرے بس میں نہیں، البتہ کہو تو نس یا کاغذ کی بتّی کی مدد سے ابھی چھینک کر دکھادوں"۔

"میں نے کہا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بے بس ہو اسی طرح ہر انسان کو سمجھو اور جب انسان بے بس ہو تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ کسی اور کے بس میں ہیں، کسی ایسی مافوق قدرت والے کے بس میں ہے جو چھینکنے نہیں دیتا۔ بڑی باتوں کو چھوڑو، اس چھوٹی سی مثال ہی سے سمجھ لو کہ خدا کو مانے بغیر چارۂ کار نہیں۔ باقی کوئی آئیں شائیں کتنی ہی بکے اس کا اعتبار نہیں"۔

"ہم نے کہا: "واہ جناب۔ آپ نے تو اُسے خوب قائل کیا"۔

"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ حق تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی جس نے ان صاحب کو لاجواب کر دیا۔ ورنہ مجھے تو کچھ آتا جاتا نہیں۔ کئی لوگ جو خدا کے وجود کے قائل نہیں جاہل یا جاہل نما لوگوں کو اُن کے عقائد سے متزلزل کرنے کے لئے چند ایسے اُلٹے سیدھے سوال کرتے ہیں جن کا جواب وہ بیچارے

نہیں دے سکتے۔ یا یا کسی وجہ سے ان دہریوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتے اس لئے یہ دہریئے اپنے منہ میاں مٹھو کی طرح اپنے آپ کو بڑا عالم فاضل سمجھ کر اپنے گندے خیالات کو ہوا دینے لگتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ان کے سوالوں کا کسی کے پاس جواب ہی نہیں ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا: "مثلاً وہ کیا کہتے ہیں؟"

"پہلی بات وہ جو چھوٹتے ہی پوچھتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر خدا ہے تو کدھر ہے، کس جگہ ہے، کہاں ہے؟"

ہم نے کہا: "ہمارے اعتقاد کے مطابق سوال ہی غلط ہے۔ سائل کو چاہئے کہ وہ پہلے اعتقاد معلوم کرے، پھر اُس پر اعتراض کرے، اگر مدعی کا اعتقاد کچھ اور ہو اور اعتراض اس پر چسپاں ہی نہ ہوتا ہو تو ایسا اعتراض سائل کی جہالت کا آئینہ دار ہوا۔ کہاں، کدھر اور جگہ کا سوال اس کے لئے ہو سکتا ہے جو کسی خاص مکان یا مقام میں رہتا ہو۔ کراچی میں ہے لاہور میں ہے، یورپ میں ہے یا افریقہ میں ہے۔ لفظ "کہاں" سے یہی مراد معلوم ہوتی ہے "کدھر" کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ شمال میں ہے یا شمال میں نہیں؟ مشرق میں ہے یا مشرق میں نہیں ہے؟ مغرب میں ہے یا جنوب میں؟ جو ذات پاک ہر جگہ ہو۔ اس کے متعلق یہ پوچھنا کدھر ہے، کہاں ہے، کس جگہ ہے، سرے سے غلط اور جہالت کا سوال ہے۔ اُسے علم سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ گوارا جاہل ہے۔"

شمیم اختر بولے: "کیا آپ یہ بات سمجھانے کے لئے کوئی مثال پیش کر سکتے

ہیں ؟"

"کیوں نہیں ؟" ہم نے کہا :"اگر ہم آپ سے یہ پوچھیں کہ ہوا کدھر اور کس جگہ ہے تو آپ کا جواب کیا ہوگا ؟"

مسکرا کر کہنے لگے :"میں اسی سوال کو الٹ کر کہوں گا کہ پہلے یہ بتائیں کہ ہوا کس جگہ نہیں ہے اور کدھر نہیں ہے ؟"

"گویا آپ ہم سے یہ کہلوا کر کہ ہوا ہر جگہ ہے، ہمارے اس سوال کو کہ وہ کدھر اور کس جگہ ہے خود ہمیں سے رد کرا دیں گے۔ بس اسی طرح ہمارے عقیدے کے مطابق چونکہ خدا ہر جگہ موجود ہے، اس لئے ہم سے یہ سوال کرنا کہ وہ کس جگہ رہتا ہے، بالکل غلط اور مہمل ہے۔ اس سوال سے ہمارے اعتقاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ یہ سوال کرنے والے کی عقل پر ہنسی آتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی سوال ہوا کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص ملتان میں رہتا ہے اور پھر بھی ہم سے یہی کہا جائے کہ وہ کہاں رہتا ہے ؟ جب ہم نے کہہ دیا کہ خدا ہر جگہ ہے تو بار بار یہی کہے جانا کہ وہ کس جگہ ہے۔ انتہائی کم عقلی اور بے وقوفی کی بات ہے۔"

شمیم ہنس پڑے :"واقعی یہ تو بہت بے وقوفی کا سوال ہوا۔ آپ نے ہوا کی مثال دے کر سوال کا بے جا اور بے محل ہونا خوب ثابت کیا۔ عقلمند کے سمجھنے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے۔"

ہم نے کہا :"اور بتائیے، یہ جہلا دوسرے اور کیا کیا سوال کرتے ہیں ؟"

"کہتے ہیں کہ خدا ہے تو وہ کیسا ہے ؟"

"اس سوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو علم کہتے ہیں۔ اس کی

انہیں ہوا بھی نہیں لگی،، ہم نے شمیم اختر سے کہا: "بس اندھے کی طرح ادھر اُدھر کی ہانکے ۔ رہتے ہیں۔ سوچنے سمجھنے کی بات ہے کہ لفظ "کیسا،، سے صفت کے متعلق سوال ہوتا ہے اور یہاں بحث ہے ذات کے متعلق کہ وہ موجود ہے یا نہیں۔ دیکھئے نا، یوں کہا کرتے ہیں کہ آپ کا مزاج کیسا ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وجود تو پہلے ہی تسلیم کر لیا۔ اب مزاج کیسا ہے یعنی بیمار ہیں، تندرست ہیں، خوش ہیں غمگین ہیں۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ سے کہے کہ جناب کا کیا حال ہے۔ کیسا مزاج ہے؟ اور اس کے جواب میں آپ یہ کہنے لگیں کہ میں انسان ہوں، آدم زاد ہوں، تو آپ کے جواب کو عقل کا جواب سمجھا جائے گا۔ یا بے عقلی کا؟ عموماً پوچھا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کا مکان کیسا ہے۔ تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ مکان کا وجود پہلے مانا جا چکا ہے، اب اسکی کیفیت معلوم کرنا ہے۔ اسی طرح خدا کے منکر نے اپنے اس سوال سے خدا کے وجود کو تو پہلے ہی مان لیا۔ اب یہ کہہ کر کہ وہ کیسا ہے اس کی صفات کو پوچھ رہا ہے اور ہم جواب میں یہ نہیں کریں گے کہ وجود ثابت کرنے بیٹھ جائیں بلکہ یہ بتائیں گے کہ وہ حلیم ہے، کریم ہے، رحیم ہے، قہار ہے، جبار ہے، سمیع ہے، بصیر ہے۔ وغیرہ وغیرہ ۔ سوال کی مطابقت سے صحیح جواب تو یہی ہو سکتا ہے"۔

شمیم اختر ہماری یہ بات سُن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: "بیشک یہ سوال تو خود منکرین اور معترضین ہی پر پڑ گیا اور ان کے سوال ہی سے خدا کا وجود ثابت ہو گیا۔ لفظ "کیسا" سے سوال کر کے انہوں نے خود بخود خدا کو تسلیم کر لیا۔ ورنہ جہالت اور بے وقوفی کا یہ سوال ہی کرنا چھوڑ دیں۔ یہ تو وہی بات

ہوئی کہ "میاں جی کی لاٹھی، میاں جی کے سر" بھلا ایسے بے جا اور فضول سوالات سے علم کا کیا واسطہ؟ نری جہالت ہی جہالت ہے۔"

"اور کیا پوچھتے ہیں؟"

"بیچارے سیدھے سادھے طلبہ کے سامنے بعض دہریئے اساتذہ فخریہ باتیں بناتے ہیں کہ ہمارے اعتراض کا جواب کوئی دے ہی نہیں سکتا۔ کم فہم طالب علم ان کے فریب میں آکر شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں"

"آخر وہ کون سا عجیب و غریب اعتراض ہے۔ ہم بھی تو سنیں؟"

شمیم اختر کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "توبہ توبہ۔ زبان قاصر ہے مگر کہنا ہی پڑتا ہے۔ نقل کفر کفر نباشد۔ وہ طلبہ سے کہتے ہیں کہ خدا کو دکھاؤ تب مانیں گے۔ بغیر دیکھے ہوئے ہماری عقل تسلیم نہیں کرتی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا ہے۔"

"ہم ان سے کہیں گے کہ عقل کا وجود تسلیم کرتے ہو یا نہیں۔ وہ ضرور کہیں گے "ہاں"، کیونکہ وہ خدا کو اپنی عقل ہی کی ترازو میں تولنا چاہتے ہیں۔ اس لئے عقل کے وجود کے دعویدار بھی ہوئے۔ اب "ہاں" میں ان کا جواب سن کر کہا جائے گا کہ جناب من۔ ذرا عقل کا دیدار تو کرادیں۔ جب تک آپ عقل کو دکھائیں گے نہیں، ہم بھی اس کے وجود کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ورنہ آپ اپنا اپنا دعوای چھوڑ دیں کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی کو مانتے ہی نہیں۔ اگر آپ نے عقل کو بغیر دیکھے مان لیا ہے تو خدا کو بھی بغیر دیکھے مان لینے میں کیا استحالہ ہے؟"

"کہنے کو تو آپ ٹھیک ہیں"، شمیم اختر نے کہا: "عقل و خرد کے جس برتن میں

وہ خدا کو ڈالنا چاہتے ہیں، پہلے اس برتن کو تو دکھلائیں کہ کہاں ہے؟"

"اور اگر وہ یہ کہہ کر ہمیں خاموش اور لاجواب کرنا چاہیں کہ عقل دماغ میں ہے تو ہم عرض کریں گے کہ دکھلایئے، سر پھوڑ لیں تاکہ وہ نظر آئے۔ حضور کس کا؟ جسے دکھانا ہو، پہلے وہ سر پھوڑے پھر دکھلائے کہ دیکھو یہ رہی عقل"۔

شمیم اختر ہنس پڑے: "پھر تو سر پھوٹتے ہی عقل غائب ہو جائے گی"۔

"ہاں" ہم نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔" وہی بات ہو گی ایک دفعہ حضرت سلیمان علیٰ نبیّنا وعلیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے دربار میں مچھروں نے دعویٰ کیا" حضور! یہ ہوا ہماری بڑی دشمن ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم کہیں خوراک حاصل کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں آپس میں کھیلتے ہیں یا کسی کا خون چوستے ہیں تو یہ کمبخت چلتی ہے اور ہم کو بھگا دیتی ہے۔ حضور اس ہوا سے ہمارا پیچھا چھڑائیں"۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا "جب تک مدعا علیہ کو نہ بلوالوں اور دونوں طرف کی نہ سن لوں، یکطرفہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ تم سب یہیں دربار میں بیٹھو۔ میں ابھی ہوا کو بلاتا ہوں۔ پھر حکم دیا کہ ہوا حاضر ہو، ہوا فوری حکم بجالانے کی خاطر تیزی سے دربار میں داخل ہوئی۔ ادھر ہوا آئی، اُدھر مچھر ہوا ہوئے۔ مدعا علیہ حاضر تو مدعی غائب ۔ اسی طرح عقل دکھانے کو بھیجا پھوڑا تو سر سے عقل ہی ندارد"۔

بے شک یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ بغیر دیکھے ہم نہیں مانتے یا ہماری عقل میں آ جائے تب مانیں گے دونوں باتیں بے تکی ہیں"۔

ہم نے کہا،" ہوا بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔ بھلا ان سے پوچھیئے کہ بغیر دیکھے آپ ہوا کو کیسے مان لیتے ہیں؟"

شمیم اختر بولے ”معاف کیجئے۔ آپ کی یہ بات دل میں نہیں اُترتی۔ ہوا کو تو اس طرح مان لیتے ہیں کہ وہ بدن کو لگتی ہے، اس سے کپڑے اور درخت ہلتے ہیں۔“

بھائی جان ”یہ تو ہوا کے وجود کی علامتیں اور نشانیاں ہیں۔“ ہم نے وضاحت کی ”گرد و غبار اور خس و خاشاک بتاتا ہے کہ مجھے ہوا اُڑا رہی ہے اور ان کا حرکت کرنا ہوا کے وجود کی علامت سمجھا جاتا ہے ہم ہوا کو نہیں دیکھتے لیکن یقین سے کہتے ہیں کہ انھیں ہوا نے حرکت دی ہے۔ مگر بذاتِ خود حرکت کا نام ہوا نہیں۔ خس و خاشاک اور گرد و غبار کا نام ہوا نہیں۔ غبار اور ہے اور ہوا کچھ اور ہے۔ غبار دکھائی دیتا ہے لیکن ہوا نظر نہیں آتی۔ کھڑکی ہلتی ہے تو کھڑکی کے کواڑوں کو ہوا کوئی نہیں کہتا سب جانتے ہیں کہ انھیں ہوا ہلاتی ہے۔ ہر ایک کو علم ہے کہ ہوا کے سرد و گرم جھونکوں سے بدن کو سردی یا گرمی محسوس ہوتی ہے مگر یہ کہنا ناممکن ہے کہ ہوا کالی ہے یا گوری، سرخ یا سفید، پیلی ہے یا نیلی حد یہ ہے کہ خود انسان کے جسم میں موجود ہے۔ مگر دکھائی نہیں دیتی۔ جانتے اور مانتے سب ہیں۔ جب ایک مخلوق کو بغیر دیکھے مان لیا تو اس کے خالق کو نہ ماننا انتہائی خلافِ عقل بات ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مخلوق ہو لیکن اس کا خالق نہ ہو!“

شمیم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے: ”یہ تو آپ نے خوب سمجھایا۔ واقعی ہوا کا ہلنا جلنا، جسم سے لگنا، پتوں میں سرسراہٹ پیدا کرنا، گرد و غبار دکھائی دینا۔ علامات اور نشانیاں ہیں یعنی ہوا کے وجود کی گواہ ہیں۔ ان علامات کو دیکھ کر

ہوا کے وجود کی تکذیب نہیں کی جا سکتی یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہوا موجود ہے۔ بس اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کی بے شمار علامات اور نشانیاں ہیں جن کو دیکھ کر ہر ذی عقل کہہ اُٹھتا ہے کہ خدا کا وجود ہے"۔

"اسی مثال کو ایک اور مثال سے سمجھیئے"۔ ہم نے کہا: "بخار کا وجود سب مانتے ہیں مگر بخار بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جو لوگ بغیر دیکھے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے، وہ بخار کو کیسے مان لیتے ہیں اور علاج کیلئے کیوں مارے مارے پھرتے ہیں؟"

"بخار کا پتہ تو نبض سے چل جاتا ہے۔ جسم کا گرم ہونا بتا دیتا ہے کہ بخار ہے تھرمامیٹر لگا کر معلوم کر لیتے ہیں"۔

ہم نے سمجھایا "ہوا کی طرح یہ سب باتیں بھی بخار پہچاننے کی علامات" ذرائع اور اسباب ہیں۔ ان سے بخار کا ہونا سمجھا جاتا ہے خود انھیں کو بخار نہیں کہتے۔ ابھی آپ نے تسلیم کیا کہ ان علامات و ذرائع سے بخار کے ہونے نہ ہونے کا پتہ لگاتے ہیں اور پھر یقینی سمجھ کر دوا کی جاتی ہے۔ تھرمامیٹر سے کس نے کہا کہ یہی بخار ہے۔ اسکی بات نہ مانو تب بھی دوسری علامات بخار کا اعلان کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ایک علامت گرمی ہے۔ سو درجے سے اوپر بخار کا ہونا شدت کی علامت۔ آنکھوں کی سرخی بدن کی اینٹھن، سردی چڑھنا اور جسم کے اعضاء کا درد کرنا دیگر علامات ہیں مگر بنفسہٖ بخار کسی کو نظر نہیں آتا۔ اچھا، دوسری مثال اور لیجیے" ایک شخص کے سر یا پیٹ میں درد ہو رہا ہے چونکہ وہ درد دکھائی نہیں دیتا اس لئے شاید اُسے بھی بغیر دیکھے تسلیم نہ کیا جائے خواہ مریض کتنا ہی چیخے چلائے ۔ یہ کروٹیں بدلنا اور ہائے وائے کرنا اور ہاتھ پیر پٹخنا سب اس درد کی علامات اور نشانیاں ہوئیں یا نہیں۔

اُنھیں سے ہم سمجھے ہیں کہ واقعی درد ہو رہا ہو گا ورنہ یوں پریشان اور ہلکان نہ ہوتا
یونہی خدا تعالیٰ کے وجود کی بے شمار و بے گنتی نشانیاں موجود ہیں۔ کسی چیز کا علم
علامات دیکھنے اور پہچاننے کے بعد یقینی ہو جاتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ میں ان علامات
کو نہیں مانتا تو پھر یقیناً ہوا کو، بخار کو، درد کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہو گا؟ ظاہر
ہے کہ وہ ان چیزوں کو نہیں دیکھتا، صرف علامات کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ کیا اس سے
لازم نہیں آتا کہ خدا کے وجود کی علامات بھی دیکھی جائیں اور ان کے بارے میں بھی
فکر کیا جائے؟"

"درست فرماتے ہیں۔ بھلا انسان کو دیکھنا ہی کیا جس پر اتنا ناز کرے آنکھ
میں دیکھنے کی طاقت بڑی محدود ہے۔ بعض انسان غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر
"ہم چوں ما دیگرے نیست" جیسی بے وقوفی کی باتیں کر لیتے ہیں ورنہ کبھی کبھی تو
دیکھنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ نہیں
کہ نابینا ہو۔ اچھی بینا ہے مگر دیکھ نہیں سکتا۔ پھر اسی کوتاہ اور کمزور نظر سے وہ خدا کو
دیکھنا چاہتا ہے۔"

"خوب سمجھے۔" ہم نے کہا: "مگر ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ بینا ہوتے
ہوئے بھی دیکھنا کیوں مشکل ہے؟"

وہ بولے "سیدھی سی بات ہے۔ رات کا گہرا اندھیرا پھیل جائے تو
سوانکھے اور اچھی نظر والے کو بھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ حقیقت
ہے نظر کی جو روشنی کی محتاج ہے۔ اتنی کمزور اور بے بس آنکھوں کے ساتھ
کسی قسم کا دعویٰ زیب نہیں دیتا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اندھیرا چھوڑیئے۔ اگر

اتنے بلب بیک وقت روشن کر دیئے جائیں جن کی روشنی دو چار ہزار وولٹ کی ہو تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ سورج میں مزید اتنی چمک پیدا ہو جائے تو کیا اسکو دیکھا جا سکتا ہے؟ اندھیرا ہی نہیں کبھی کبھی نور بھی دیکھنے سے مانع ہو ہو جاتا ہے"۔

شمیم اختر بڑی دور کی بات لائے تھے، ہم خاموش بیٹھے ہوئے ان کی بات سنتے رہے۔ ایک لمحہ سانس لے کر وہ پھر بولے: "اگر کسی کے انوار و تجلیات سورج و بلب کی روشنی اور چمک دمک سے بے انتہا افضل اور برتر ہوں تو اس میں کون استحالۂ عقلی ہے۔ جب معمولی چمک کے باعث ایک مخلوق کی طرف دیکھنے سے ہماری نظریں عاجز ہو جائیں تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی لیکن جو خالق انوار ہیں۔ روشنی اور چمک دمک کو پیدا کرنے والے ہیں۔ ان کے انوار نظر کی کمزوری کی وجہ سے دکھائی نہ دیں تو یہ کہہ کر انکار کر دیا جائے کہ بغیر دیکھے ہوئے ہم انھیں تسلیم نہیں کریں گے ؏ دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ؏ ۔ پتّہ پتّہ یہی کہتا ہے کہ موجود ہے تو"۔

ہمارے منہ سے بے ساختہ تحسین و تعریف کے الفاظ نکل گئے شمیم اختر کی بات پر یقین کئے بغیر رہا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ البتہ ہٹ دھرم اور نہ ماننے والے کے لئے دفتر کے دفتر بیکار ہیں۔ ایسے ضدّی لوگوں کے لئے اس شخص کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جس نے کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں گھر آکر افسوس کر رہا تھا کہ اتنی فاش غلطی کیوں کی۔ اس کی لڑکی نے اُسے پریشان اور متفکر دیکھ کر پوچھا

"کیا بات ہے ابا۔ آج تم اُداس کیوں ہو؟" ــــ وہ بولا: "آج غلطی سے یہ کہہ آیا ہوں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ اب لوگوں میں یہ بات پھیلے گی اور سب کے سامنے خفت اٹھانا پڑے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں"۔

بیٹی کہنے لگی: "واہ ابا۔ یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے۔ تم ماننا ہی نہیں، چاہے ساری دنیا کہے مگر تم اڑے رہنا کہ نہیں۔ دو اور دو تو پانچ ہی ہوتے ہیں جب تم اپنی غلطی مانو گے نہیں تو خفت کسی بات کی ہوگی"۔

یونہی یہ منکرین ہیں۔ طے کر چکے ہیں کہ ماننا ہی نہیں ہے اب کس میں ہمت ہے کہ جو انھیں منوائے۔ حق کی تلاش ہو اور ضد و عناد سے الگ تھلگ رہیں تو دل خود بخود اللہ کے وجود کی شہادت دے۔ یہ تو ایک فطری بات ہے شاید انھیں بھی یہ خوف دامنگیر ہے کہ اپنی غلطی تسلیم کر لی تو لوگوں کے سامنے خفت ہوگی لیکن انھیں یہ علم نہیں کہ اکثریت انھیں احمق اور بے وقوف سمجھتی ہے۔ یہ تو ہوئی دنیا والوں کی قدر دانی اور آخرت میں جو قدر دانی ہوگی، اس کے بارے میں خود ہی سوچ لیں۔

آپ سے یہ سوال کیا جائے کہ ہوا کہاں ہے، کس طرف ہے۔ میدان میں کھڑے ہو کر سوال کیا جائے کہ روشنی کہاں ہے؟ اس کا جواب یہی ہوگا کہ ہوا اور روشنی ہر طرف اور ہر جگہ ہے۔ یہ سوال تو ایک سمت میں ہونے والی چیز کے متعلق ہو سکتا ہے۔ اور جو ہر جگہ ہو اس کے متعلق لفظ کہاں اور کس طرف یا کس جگہ سے سوال کرنا ہی بے جا ہے، خوب سمجھ لیں۔

⁂

باب ۴

دین کی چاٹ کچھ ایسی ہے کہ ایسی ہے کہ کسی کے منہ کو لگ جائے تو چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ دنیا کی باتیں تو ہیں نہیں کہ تھوڑی ہی دیر میں طبیعت اکتا جائے یہ تو اپنے خالق و معبود اور محبوب کی باتیں ہیں کہ جتنا ذکر کیا جائے، جتنی تکرار کی جائے۔ اتنا ہی لُطف آئے۔

اگلے روز ہمیں باغیچہ جانے میں کچھ دیر ہوگئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں شمیم اختر چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی پوچھنے لگے: "کیا بات ہے؟ نصیبِ دشمناں آپ کی طبیعت تو کچھ ناساز نہیں؟"

ھم نے کہا" نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آنے کا ارادہ تھا لیکن کچھ کاہلی سوار ہوگئی سوچا آپ سے ملنے کا وعدہ تو کیا نہیں ہے۔ ذرا ٹھہر کر چلے جائیں گے"۔

انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ کچھ دیر ہم دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ساتھ ساتھ باغیچے کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں انھوں نے کہا: "آجکل دہریت کا بڑا زور ہو رہا ہے۔ بے چارے طلبہ کچّی لکڑی ہیں جدھر گھماؤ آسانی سے اُدھر ہی گھوم جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مذہب سے واقف نہیں

ہوتے اس لئے ہر مقرر کی بات کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور اسی طرح کی بولیاں بولنے لگتے ہیں۔ ان کو سمجھانے والوں کا بھی دین کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے زیادہ تر تو ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو مغرب سے مرعوب ہیں اور انھیں مغرب والوں کی ہر ادا و ہر صدا پسند ہوتی ہے۔ کچھ یہ بھی ہے کہ سائنس کی ترقی دیکھ کر مغربی حضرات کی بھلی بُری سبھی باتیں اچھی لگنے لگتی ہیں۔

ہم نے کہا: "ہاں بھائی۔ مغربی اقوام نے مسلمانوں سے جنگ کر کے خوب اچھی طرح آزما لیا کہ یہ لوگ تلوار سے زیر نہیں ہو سکتے۔ آخر اچھی طرح سوچ بچار کر کے انھوں نے دوسرا حربہ استعمال کیا کہ مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کیا جائے۔ یہ لوگ اپنے ایمان کی طاقت کے بل بوتے پر پہاڑوں سے ٹکراتے اور سمندروں کے سینوں میں اُتر جاتے ہیں۔ ایمان کمزور ہو جائے گا تو ان کی طاقت بھی دم توڑ دے گی۔ چنانچہ ایمان کمزور کرنے کے لئے انھوں نے تعیّش کا جال پھیلایا، مسلمانوں کو اسکی طرف راغب کیا اور اپنے قول و فعل سے مسلمانوں کے دلوں میں چپکے چپکے اسلام کی فرضی برائیاں اس طرح ذہن نشین کیں کہ مسلمان یہ نہ سمجھ پائیں کہ اسلام کی برائی کی جا رہی ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے ان کی کوشش یہی رہی کہ مسلمان ان کا راگ الاپنے لگیں۔"

شمیم اختر نے حیرت سے کہا: "آخر مسلمان ان سے اتنے مرعوب کیوں ہوئے؟"

ہم نے کہا: "پہلی وجہ تو یہی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب سے دوری اختیار کی۔ دوسری طرف مغرب والوں نے مسلمانوں کی کمزوریوں اور خامیوں کو اسلام کی کمزوریاں اور خامیاں بتایا اگر مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرے ذاتی فعل کو اسلام کی تعلیم پر منطبق کیا جائے

اور یہ کہا جائے کہ چونکہ فلاں شخص ایسا ہے، اس لئے اسلام بھی اسی جیسا ہوا۔ غرضیکہ مغرب والوں نے علماءِ سوء اور نمائشی دینداروں کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دبی زبان سے اسلام کو کبھی مُلّا کا مذہب کہہ دیا اور کبھی استنجے کے ڈھیلو کا طعنہ دیا۔ اس قسم کی کوششیں کیں کہ مسلمان اپنے مذہب سے دور سے دور تر ہوتے چلے جائیں اور عیش وعشرت میں پڑ کر ان سے مقابلہ کرنے کے بجائے ان کے غلام بن کر رہیں۔ اخبار، رسالے، سینما، تھیٹر آہستہ آہستہ مسلمانوں کی رگوں میں زہر آلود نشتر گھونپتے رہے۔ جس نے ان کی تقلید کی، خوش ہو کر اُسے سر پر چڑھا لیا، اُسے ترقی پسند، مآل اندیش اور عاقل و فرزانہ کا لقب دیا جو بہکانے میں نہ آیا وہ رجعت پسند، لکیر کا فقیر اور بے وقوف و نادان کہلایا ــــ جب ان لوگوں کی اخلاق سوز حرکات ناپختہ و ناتجربہ کار نوجوانوں کے سامنے آتی ہیں تو ان کی راتوں کی نیندیں کافور ہو جاتی ہیں۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ انھیں رجعت پسندی کا طعنہ سننے کے بجائے ترقی پسند ہونے کا مژدہ سنایا جائے چنانچہ ترقی پسندی کے زعم میں وہ مذہب سے بیزاری اور دہریت کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ نام سائنس کی ترقی کا لیتے ہیں جو مادیات میں سے ہے اور اعتراض خدا اور دین پر کرتے ہیں۔ بھلا کوئی تُک ہے ــــ دیکھئے نا اس طرح انجکشن دیا جاتا ہے کہ میاں امریکہ چاند پر جا رہا ہے اور تم ابھی رکعتیں ہی گن رہے ہو ــــ بھلا چاند پر جانے سے اس بات کا کیا جوڑ؟ کیا استنجاء اور رکعات چاند پر جانے سے منع کرتی ہیں؟ یا اسلام نے منع کر دیا ہے؟ ہمارے وہ اہلِ ملک جو نہ رکعات گنتے ہیں اور نہ کبھی ان کو استنجے کی توفیق ہوتی ہے بلکہ رات

دن سائنس ہی پڑھتے رہتے ہیں، اب تک کونسا راکٹ بنانے والے بن گئے ہیں۔ کیا کیا کوئی ایسی جماعت تیار ہو گئی ہے جو چاند پر جانے کی تیاریاں کر رہی ہو؟ محض لفاظی ہے۔ دین کو ہاتھ نہ لگا۔ رکعات بھی چھوڑیں۔ جسم بھی نجس رہا اور پھر بھی چاند پر نہ پہنچے ۔۔۔ نہ ادھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے ۔۔۔ صرف دھوکہ اور فریب ہے ایسا دھوکہ اور فریب جو بذاتِ خود اپنے آپ کو بھی دے رہے ہیں اور اپنے دوست احباب کو بھی۔ دھوبی کے کُتّے کی طرح ہیں جو نہ گھر کا رہتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔"

شمیم اختر بولے: "ہاں جناب! یہ تو ہمارا مشاھدہ بھی ہے کہ ولایت بلا کر ڈگریاں دے دیتے ہیں اور اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرنے یا ایجادات کے چلانے والے بنا کر واپس بھیج دیتے ہیں۔ پسماندہ ملکوں میں نئی ایجاد کرنے والوں کو اُبھرنے ہی نہیں دیتے۔ کوشش یہ کرتے ہیں کہ بازار میں صرف انہی کی ایجادات نظر آئیں اور اُنھیں کو موجد تسلیم کیا جائے۔

.... چنانچہ جب کوئی شخص بزعم خود اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی نئی ایجاد ضرور ہوتی ہے۔ یہاں فوراً شہرت ہو جاتی ہے کہ فلاں صاحب ولایت سے تعلیم پا کر آئے ہیں اور ایک بہترین مشین اپنے ساتھ لائے ہیں بس اس طرح اس ایجاد کی شہرت ہو جاتی ہے۔ اگر دیگر اقوام کی ایجادات کی فروختگی اور اپنے ملک میں ان کے اجراء کا نام ہی سائنس ہے۔ تو ایسی سائنس کو دور ہی سے سلام ان اعلیٰ تعلیم یافتہ ولایت پلٹ لوگوں سے زیادہ سائنس تو ہمارے ملک کے وہ غریب اور بے پڑھے لوگ جانتے ہیں جو بڑی بڑی مشینوں کو چٹکی بجاتے میں درست کر دیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ حضرات نئی ایجاد کرنا تو درکنار، خود اپنی مشینوں کو درست

؏ یہ اس وقت کی بات ہے جب کوئی شخص چاند پر نہ گیا تھا اور اب بھی اربوں روپے خرچ کرکے گئے تو

نہیں کر سکتے۔"

ہم نے کہا، جگر مراد آبادی نے ایسے ہی تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں کہا ہے سہ

جہل خرد نے دن یہ دکھائے   گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

یعنی اگر ان عقلمندوں جاہلوں سے یہ پوچھا جائے کہ انسان بڑا ہے یا اس کا سایہ تو فوراً پیمانے سے ناپ کر بتائیں گے کہ سایہ کے مقابلہ میں انسان بہت چھوٹا ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ کیا خدا کو مان کر سائنس نہیں پڑھی جا سکتی؟ اگر خدا کو مان لیا تو کیا ہوائی جہاز اُڑنے سے انکار کر دے گا یا مشین نہیں بنائی جا سکے گی یا چاند پر جانا ناممکن ہو جائے گا۔؟ سائنس کی ترقی اور نئی نئی ایجادات کا اس مسئلہ سے کیا تعلق؟ خدا کو مان کر بھی آپ ایجادات کر سکتے ہیں۔ لیکن شمیم صاحب وہ تو سائنس اس لئے شروع کرتے ہیں تاکہ ایمان جاتا رہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مادّہ پرست کہتا ہے "یہ ایجاد سائنس دان نے کی"! اور خدا پرست دعویٰ کرتا ہے کہ: "خدا نے اس سے یہ ایجاد کرا دی"! ہاں اگر خدا کا نام شامل کر دینے سے ایجاد نہ کہا جا سکے تو آپ خدا پرست کے دعویٰ کو رد کر سکتے ہیں۔ غضب خدا کا۔ بیوقوف یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کو ماننے والے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ذرا تاریخ اٹھا کر دیکھئے۔ رکعات گننے اور استنجا کرنے والوں نے کیسی بڑی بڑی ایجادات کی ہیں۔ گھڑی کس نے ایجاد کی قطب نما بنانے والا کون تھا۔ ریاضی میں الجبرا کو کس نے روشناس کرایا۔ علم الابدان پر سب سے پہلے کس نے تحقیق کی۔ تیر بہدف دوائیں کس نے ایجاد کیں؟ سب سے پہلی دُور بین کس نے ایجاد کی؟ گولہ بارود، بندوق توپ اور بم پہلے کس نے استعمال کئے؟ حقیقت یہ ہے سائنس کی ہر ترقی مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ یہ جو چاند پر جانے

ہیں یہ ایک مسلمان فلاسفر ابوالحیان کا عطیہ ہے۔

باتوں میں پتہ بھی نہیں چلا کہ باغیچہ آگیا ہے۔ دروازے پر کھڑے ہوئے مالی نے ہم دونوں کو سلام کیا، تب ہمیں معلوم ہوا کہ ہم لوگ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اندر پہنچ کر معمول کے مطابق بنچ پر بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا: "کل اس بات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ کسی شئے کا وجود صرف دکھائی دینے پر منحصر کرنا غلط ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بغیر دیکھے ہوئے تسلیم کر لی جاتی ہیں لہٰذا ہر چیز کے متعلق یہ کہنا کہ پہلے دکھاؤ تب مانیں گے بالکل عقل کے خلاف ہے۔ سینکڑوں چیزیں اپنی علامات اور نشانیوں ہی سے پہچانی جاتی ہیں اور بغیر دیکھے ہوئے ان پر یقین کامل کر لیا جاتا ہے اس حقیقت سے انکار کرنا گویا ہدایت کا انکار کرنا ہے۔"

شمیم اختر کہنے لگے: "کیا آپ اس بات کی کوئی نشانی دے سکتے ہیں کہ علامات سے کسی شئے کے وجود کو تسلیم کر لینا عقل کا تقاضہ ہے۔"

"دیکھئے"، ہم نے کہا: "آپ مکان کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے آفتاب نظر نہ آ رہا ہو لیکن دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی ہو۔ یہ دھوپ آفتاب کے آسمان پر ہونے کی علامت ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ دھوپ تو مانتا ہوں کہ پھیلی ہوئی نظر آ رہی ہے مگر آفتاب چونکہ نظر سے اوجھل ہے اس لئے اُسے نہیں مانتا۔ ایسے شخص کو احمق ہی کہا جائے گا۔ یہ نہیں کریں گے کہ باہر لے جا کر اُسے آفتاب دکھائیں۔ پھر تو اس نے دھوپ کو علامت ہی نہیں سمجھا۔ حالانکہ دھوپ کے وجود کی آفتاب کے وجود پر کامل دلالت ہے وہ شخص عقل کا اندھا ہے جو دھوپ کو دیکھنے کے باوجود آسمان پر آفتاب

ہونے کا انکار کرے اسی طرح زمین، آسمان، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، ہوا سمندر اور دوسری بے شمار چیزوں کو دیکھ یقیناً کہنا پڑے گا کہ ان کا وجود ان کے مالک کے وجود کی دلیل ہے۔ جس طرح دھوپ کو دیکھ کر آفتاب نہ دیکھنے کا بہانہ کر کے اس کا انکار کرنا حماقت ہے، اسی طرح اشیاء کو دیکھ کر ان کے پیدا کرنے والے کو نہ ماننا اور دیکھنے پر اصرار کرنا بھی حماقت ہے۔"

شمیم اختر بہت غور اور سنجیدگی سے ہماری بات سن رہے تھے۔ ہم خاموش ہوئے تو کہنے لگے: "کوئی اور مثال؟"

ہم نے کہا: "آپ کسی بند گھر سے گہرے دھوئیں کے بادل اُٹھتے ہوئے دیکھیں تو فوراً کہیں گے کہ اس میں آگ لگی ہے۔ آپ کی یہ بات سُن کر کوئی احمق کہے کہ دھواں تو بے شک اُٹھ رہا ہے مگر آگ کو بغیر دیکھے کیسے مان لیا جائے؟ ہے نا احمق۔ ارے یہ دھواں آگ کے وجود کی علامت ہے۔ اس علامت سے ہر شخص اس گھر میں آگ کا وجود تسلیم کرتا ہے اور اس کو بجھانے کے لئے بھاگتا ہے۔ ادھر ادھر ٹیلیفون کرتا ہے آگ بجھانے والے انجن منگاتا ہے۔ آنجناب آگ کو بغیر دیکھے تسلیم ہی نہ کریں گے اور اتنے میں مکان جل بھن کر راکھ ہو جائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ ایسی ہی عقل کے دو چار آدمی اور نکل آئیں تو پورا محلّہ ہی خاک ہو جائے گا۔ بھائی دھواں آگ کے وجود کی نشانی ہے اس نشانی سے آگ پر استدلال کرنا عین عقلِ سلیم کی بات ہے بالکل اسی طرح کائنات کی علامات اور صنعتِ ارض و سما دیکھ کر ان کے بنانے والے کا وجود تسلیم کرنا عین فطرت اور موافق عقل کے ہے۔ تسلیم نہ کرنا خلافِ عقل و

دانش ہے۔"

ہماری اس بات پر شمیم اختر کو کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگے: "ایک مرتبہ ہم ایک دہریہ کے ساتھ مٹی کے برتن لینے گئے۔ ہم نے دو گلاسوں اور دو پیالوں اور چھ پیالیوں کا سودا کیا۔ دہریہ برتنوں کو بجا بجا کر دیکھنے لگا اور کئی برتن اس نے الگ رکھ دیئے کہ یہ چٹخے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا: "جناب! آپ انھیں چٹخا ہوا کیوں کہہ رہے ہیں۔ کوئی لکیر بھی نظر نہیں آ رہی ذرا دکھلائیں تو سہی یہ برتن کہاں سے چٹخ رہے ہیں۔ آخر بغیر دیکھے اچھے بھلے برتنوں کو ہم چٹخا ہوا کس طرح مان سکیں؟" اس پر وہ اس طرح ہنسنے لگا جیسے مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہو۔ بولا: اگرچہ چٹخنے کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا مگر کھوکھلی آواز سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ٹوٹے ہوئے ہیں۔" میں نے فوراً کہا: "حضور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر مٹی کے برتن میں خامی دیکھ لی۔ آپ کے برتن بجا کر کھوکھلی آواز کا پتہ چلانا چٹخنے والے وجود کی دلیل اور علامت سمجھا جاتا ہے۔ یعنی آپ دلیل اور علامت سے چٹخنے کا یقین تو کر لیں مگر کائنات کے دلائل اور علامات صانع دیکھ کر بھی خدا پر یقین نہیں۔" آدمی ذہین تھا۔ کہنے لگا: "سمجھ گیا" اور قائل ہو کر ایمان لے آیا اور ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کو برے الفاظ سے یاد کر کے کہنے لگا جنہوں نے اُسے باور کرا دیا تھا کہ جب تک کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا جائے، اُسے ہرگز تسلیم نہ کیا جائے۔

اسی طرح ہمارے بچپن کے زمانے میں انگریزوں کی حکومت تھی ملکہ وکٹوریہ اور شاہ ایڈورڈ کے چاندی کے روپئے چلتے تھے۔ نوٹ بہت

کم تھے۔ لوگ ان روپیوں کی چٹکی لگا کر دیکھتے تھے کہ کھرے ہیں یا کھوٹے۔ دوکان دار نے چٹکی لگائی اور کھوٹے کھوٹے ایک طرف اور کھرے کھرے دوسری طرف نکال کر رکھ دیئے۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ روپئے اس کے سامنے نہیں بنے، نہ اس نے توڑ کر اور گلا کر دیکھے کہ ان میں کھوٹ ملی ہے یا نہیں۔ صورت اور شکل میں کھوٹے اور کھرے میں بالکل فرق نہیں۔ پھر اُسے کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ اور صاحب یہی نہیں۔ گاہک بھی آواز سن کر اپنے روپے واپس لے لیتا، نہ لے تو جھگڑا ہوتا۔ کیونکہ آواز کی کھنک سے پہچان لیا۔ یقین کر لیا کہ چاندی کھری نہیں ہے۔ حالانکہ کھوٹ دکھلائی بھی نہیں دیا۔ مگر بغیر دیکھے تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ بیشک اس میں کھوٹ ہے اور یہ کھرا ہے۔ اور آواز اُس کے کھرے کھوٹے ہونے کی دلیل، علامت اور نشانی ہے۔ گویا دلیل، علامت اور نشانی سے کھرے کھوٹے ہونے کے وجود کا یقین ہو جاتا تھا۔ دہریہ بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ کھوٹ چونکہ نظر نہیں آتا: اس لئے کھوٹ ووٹ ہمیں دے دو برتن بھی پرکھنا ہے اور بغیر دیکھے کھوٹے اور ثابت اور چھنے ہوئے کے وجود کا قائل ہے مگر اللہ میاں کی بے شمار مصنوعات دیکھ کر بھی انکار ہی کئے جاتا ہے۔ اس سے زیادہ بیوقوف بھلا اور کون ہوگا؟"

شمیم اختر کی بات پر ایک قصہ ہمیں بھی یاد آگیا۔ ہم نے کہا: "ایک روز ہم چند دوستوں کے ساتھ ایک گنجان باغ میں بیٹھے تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے اتنے تیز تھے کہ جسم کے کپڑے اڑے جا رہے

تھے۔ کچھ دیر بعد ہوا کی شدّت میں کمی ہوئی۔ بادل چھا گئے۔ موسم خُنک ہو گیا۔ پرندے خوشی سے چہچہانے لگے۔ مینا بولی۔ دوستوں نے بیک زبان کہا "یہ مینا ہے"! طوطے کی آواز آئی۔ دوست بولے: "یہ ٹیں ٹیں طوطے کی ہے"۔ سب نے یقین کیا، حالانکہ پرندے دور تھے، کوئی لمبی لمبی گھاس میں تھا اور کوئی پتّوں میں چھپا ہوا تھا۔ مگر ان کی آوازوں پر سب یک زبان ہو کر کہتے تھے کہ ہاں یہ بُلبل چہک رہی ہے۔ یہ فاختہ کی کُوکُو ہے۔ یہ کوئل کوکی۔ یہ مور بولا۔ وہیں اتفاق سے ایک عقل کا اندھا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا: "تم لوگ ان پرندوں کو دیکھے بغیر صرف آواز سُن کر کیوں یقین کئے لے رہے ہو کہ یہ مینا ہے اور وہ بُلبل ہے یہ طوطا ہے اور وہ کوئل ہے سب نے سمجھانے کی کوشش کی انکی آوازیں اُن پرندوں کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اور ہم فوراً پہچان لیتے ہیں کہ یہ آواز کس کی ہے اور وہ کس کی ہے۔ وہ بیوقوف بولا: "کیوں صاحب ممکن ہے کہ مور کی آوازمیں میں چیل بول رہی ہو اور فاختہ کی آواز میں مینا کوک رہی ہو۔ بغیر دیکھے ہوئے آپ اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ یہ مینا اور وہ طوطا ہے"۔ اب اس احمق کو کون سمجھاتا کہ آواز ان پرندوں کے وجود پر یقین کے ساتھ دلالت کرتی ہے۔ اس کے خلاف ممکن ہی نہیں۔ بس معاً خیال آیا کہ دہریۂ کائنات کی صنعتوں کو دیکھ کر صانع کے وجود کا انکار کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔ وہ تو اس احمق سے بھی گیا گزرا ہے صانع اور خالق کو ماننا عین عقل کی بات ہے۔ بغیر کسی شبہہ کے تمام پھلوں، پھولوں، بیلوں، سبزیوں اور ان کی جداگانہ بناوٹ اور تراش خراش کو دیکھ کر یقین کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خداوند تعالیٰ موجود ہے، اور اسکی کارگزاری اور اسکی حکمت کائنات

کے ہر ذرہ سے عیاں ہے۔ اس کے حکم سے زمین و آسمان بنے اور اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ انسان کو عقل عطا فرمائی ہے جس سے وہ کمال کی چیزیں ایجاد کرتا ہے اور بے وقوفی سے اپنا کمال سمجھ بیٹھتا ہے۔ حالانکہ کمال تو اس کا ہے جس نے عقل دی۔ عقل نہ دیتا تو کیا کرتے۔ بہت سے انسان بے عقل ہوتے ہیں۔ اگر انسان خود خالق ہوتا تو بے عقل تو کوئی بھی نہ رہتا۔ کون چاہتا ہے کہ میں بے عقل رہوں۔ پھر بھی اس دنیا میں ایسے بے عقل لوگوں کی کمی نہیں جیسے یہ دہریئے ہیں۔ موٹی موٹی بات بھی نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنا چاہتے ہیں اور اٹکل کے تکے چلائے جاتے ہیں۔ محض تخمینے، اندازے۔ ظن اور خیال پر انحصار کر کے بات کرتے ہیں خدا ان کی صحبت سے ہم سب کو بچائے اور انھیں نیک ہدایت دے"۔

"آمین" شمیم اختر نے جلدی کہا: "اب تو میرا سینہ بھی کھل گیا ہے۔ میں دیوار کے پیچھے کی آواز سُن کر سمجھ لیتا ہوں کہ بولنے والا زیدؔ ہے۔ عمرؔ ہے یا اجنبی ہے۔ ان کی آواز ان کے وجود پر دال ہے۔ اگر وہ زید بولے اور میں آواز پہچان لینے کے باوجود کہوں کہ زید نہیں ہے تو میری بے وقوفی ہو گی۔ اجی جناب! گھر میں بیٹھے ہوئے ہوں، دروازہ بند ہو مگر باہر کی آوازیں سُن کر کہتے ہیں کہ فلاں کی موٹر آ رہی ہے۔ اسٹرک پر گھوڑا جا رہا ہے۔ فضا میں ہوائی جہاز اُڑ رہا ہے۔ ان کی آوازیں ان کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ حالانکہ ان کی آوازوں اور جسموں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گھوڑا نہیں، کار کی آواز بذاتِ خود

کار نہیں۔ جہاز کی گڑگڑاہٹ کو جہاز نہیں کہہ سکتے" لیکن ہر آواز اپنی اپنی جگہ پر اسباب کی علامت و نشانی ہے کہ سڑک پر گھوڑا ہے یا کار ہے، آسمان پر جہاز ہے یا ہیلی کوپٹر ہے۔ جس طرح دیکھ کر کسی چیز کا یقین ہو جاتا ہے اسی طرح بغیر دیکھے علامات کو دیکھ کر یا سنکر بھی یقین آجاتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے۔ کسی ننھے سے بچے تک نے کبھی ہوائی جہاز کی آواز سن کر یہ نہیں کہا کہ آسمان پر موٹر کار چل رہی ہے۔ مگر دہریہ بچے سے بھی بچکانہ ذہن رکھتا ہے اور علامات دیکھنے کے باوجود صاحب علامات کا انکار کرتا ہے۔ یعنی وہ اتنا بدھو ہے کہ موٹر کی آواز پر تو یقین لے آتا ہے مگر موٹر کا وجود نہیں مانتا۔ گھوڑے کی ٹاپیں تو یقینی ہیں کیونکہ کانوں میں سنائی دے رہی ہیں مگر گھوڑے کو نہیں مانتا۔ ہوائی جہاز کی آواز تو درست لیکن ہوائی جہاز کو تسلیم نہیں کرتا۔ واہ رے بے وقوف۔ آسمان و زمین۔ دریا پہاڑ۔ انسان حیوان تو موجود ہیں لیکن ان کا پیدا کرنے والا، پرورش و پرداخت کرنے والا، تھامنے اور سنبھالنے والا نہیں ہے۔ ہوا ہے مگر اس کا چلانے والا نہیں ہے، بارش تو ہے مگر برسانے والا کوئی نہیں ہے، دریا تو ہے مگر اسے رواں دواں رکھنے والا نہیں ہے۔ کھیتی تو ہے مگر اسے اگانے ہرا بھرا رکھنے اور رس اور مٹھاس پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ زمین کے اجزاء ہیں، پانی ہیں، پھولوں، پھلوں کے بیجوں میں تاثیر تو ہے مگر ان میں تاثیر رکھنے والا کوئی نہیں.....

"احمق! اگر تو خود ہی خالق ہے تو تیرا بیٹا کالا کیوں ہے؟ اسکی ناک چپٹی ہے۔ ٹھیک بنالے چال میں فرق ہے، اسے ٹھیک کردے۔ اس کا

سر بڑا اور چہرہ چھوٹا ہے، دونوں کو درست کر لے ۔ اور اگر تیرے اصول کے مطابق انسان خود بخود وجود میں آگیا ہے۔ تو تجھے نکاح کی کیا ضرورت تھی۔ تیری اولاد جنگل میں اُگ آتی۔ دو چار بیٹے آم کے پیڑ سے توڑ لاتا۔ خود بخود کو بھی ایک ہی رہی۔ آم میں جامن کیوں نہیں آتے۔ امرود میں گاجر کیوں نہیں آتیں۔ بھینس کے خود بخود بکری پیدا ہو جاتی۔ تیرے نزدیک تو کوئی اصول اور کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ کوئی حکمت والا، باریک بیں، منتظم اور خالق نہیں ہے تو دنیا کا نظام ایک مخصوص اصول اور ضابطے پر کیسے چل رہا ہے۔ خود بخود روٹی نہیں پکتی۔ خود بخود مکان نہیں بنتا، ریل، جہاز، موٹر اور قلعے خود بخود نہیں بنتے۔ جب دنیا کی یہ چھوٹی چھوٹی اشیاء اپنے آپ نہ بنیں بلکہ بنانے والا بنائے تب بنتی ہیں تو جس عالم کے اجزاء اپنے بنانیوالے کے محتاج ہیں۔ اس عالم کے بڑے اجزاء مثلاً آسمان، زمین، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، ستارے بھی کسی کے بنائے ہی بنے ہوں گے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ مشین کے کچھ اجزاء تو بنائے گئے اور کچھ خود بخود بن گئے۔ چند پُرزے کسی نے بنا دیئے مگر مشین کے اُوپر نیچے کی چادریں اپنے آپ بن کر لگ گئیں کہیں سُنا ہے کہ کاریگر نے مشین کے کل پُرزے بنائے ہوں لیکن اس مشین کی زمین اور چھت خود اُڑ کر لگی ہوں۔ دُنیا کی چیزیں تو بغیر بنائے بن نہیں سکتیں پھر بھی کچھ بیوقوف یہ سمجھتے ہیں کہ زمین جس پر یہ چیزیں قائم ہیں، آپ ہی آپ بن گئی۔ اُن کے نزدیک زمین کا کوئی خالق ہی نہیں۔ اُڑ کر کہیں سے آگئی ہے ۔ واہ رے بیوقوف دہریئے کچھ تو عقل سے کام لیا ہوتا۔ عقل کی رٹ لگا کر اور بار بار اپنے آپ کو عقلمند اور دانش ور اور ترقی پسند کہہ کر عقل و دانش کے خلاف بات کہنا کہاں کی دانائی ہے ⁂

باب ۵

شمیم اختر کسی ضروری کام سے کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ رہ رہ کے ان کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ آئیں تو باہم عجائباتِ قدرت کا مطالعہ کریں۔ ان فطری امور پر جو حیوانات اور نباتات کو کسی نے اپنی حکمت سے ودلیت کئے ہیں، غور کریں۔ یہ سوچیں کہ حیوانات کو کوئی معلّم تعلیم نہیں دیتا۔ خود ان کی زبان نہیں جو کلام سمجھ اور سمجھا سکیں۔ پھر بھی کسی ظاہری تعلیم و تعلّم کے بغیر ان کے اندر ایسی عجیب باتیں پائی جاتی ہیں کہ عقل انسان یہ کہے بغیر نہیں رہ سکی کہ کسی عظیم قدرت نے ان حیوانات کو یہ تمیز بخشی ہے۔ بھلا بے زبان جانور کی یہ باتیں اور یہ خصلتیں خود ان کی پیداوار کیسے کہی جا سکتی ہیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ جس نے ان جانوروں کو پیدا کیا، اسی نے ان کو نفع و ضرر کی باتیں اس خوبی کے ساتھ بتائی ہیں کہ ادھر جانور دنیا میں آیا اور ادھر اس کو ان سب باتوں کا ادراک ہو گیا۔ واقعی یہ سب سوچنے اور سمجھنے کی باتیں ہیں اور ان میں عقل والوں کے لئے بڑی علامات و نشانیاں ہیں۔

دل ہی دل میں ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ

ہوتے ہیں اور جنگلوں میں دس پانچ مختلف بھیڑ بکریوں کے بچے پیدا ہوتے ہیں بلکہ رات کے وقت جب کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوتا ہے، اور چرواہا گہری نیند سو رہا ہوتا ہے، بھیڑوں اور بکریوں کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں صبح کو چرواہا ان کو جنگل لے جاتا ہے تو ہر بچہ اپنی ماں کے ساتھ ہو جاتا ہے اور اپنی ہی ماں کا دودھ پیتا ہے دوسری بکری کے نہیں پلٹتا۔ بکریاں اور بھیڑ.یں بھی اپنی اولاد کو پہچانتی ہیں اور اپنے ہی بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ دوسرے بچوں کو مار کر بھگا دیتی ہیں۔ حالانکہ اندھیرے کے باعث نہ ماں نے بچوں کو دیکھا ہوتا ہے اور نہ بچوں نے ماں کو اور صبح کی روشنی پھیلتے ہی چرواہا سب کو باہر ہی ہانک دیتا ہے پھر بھی ماں کو پہچاننے میں نہ بچے غلطی کرتے ہیں اور نہ بچوں کو پہچاننے میں ماں سے غلطی ہوتی ہے،

اور صرف یہی نہیں بلکہ بکریاں اور بھیڑ.یں ہاتھی اور اونٹ کو بھی دیکھتی ہیں۔ گائے اور بھینس بھی ان کے سامنے آتی ہیں۔ گھوڑے اور گدھے بھی نظر آتے ہیں۔ سب ہی کو دیکھتی ہیں اور خواہ ان میں سے کسی جانور کو پہلے نہ دیکھا ہو، مگر ان سے بالکل نہیں گھبرائیں۔ اور بھیڑیئے کو پہلی بار ہی دیکھتی ہیں تو خوف کھا جاتی ہیں، بچنے لگتی ہیں۔ انھیں کس نے بتایا کہ یہ تمھیں کھا جائے گا حالانکہ وہ صرف نظر آیا ہے۔ نہ حملہ کیا ہے اور نہ اس کا رخ ان بھیڑ بکریوں کی طرف ہے۔ اور کتے سے بھیڑ بکریاں نہیں بھاگتیں حالانکہ کتا اور بھیڑیا ملتے جلتے ہیں۔

سنا ہے کہ دریائے دجلہ کے کنارے چرنے والی بکریاں بھیڑیئے

کی جھلک دیکھتے ہی دریا میں کود کر چھپ جاتی ہیں اور جب وہ چلا جائے تو پھر باہر آکر چرنے لگتی ہیں۔ کیا یہ باتیں کسی ذیشان ذات کے وجود پر دلالت نہیں کرتیں؟ اپنے آپ بھلے بھل جانور کو یہ شعور کس نے بخش اور یہ باتیں اس کے دل میں کس نے ڈالیں۔ صرف ایک وحدہٗ لاشریک نے۔ دہریوں کے اسکول میں تو یہ سیکھنے سکھانے گئی نہیں تھیں۔ کچھ تو غور کریں۔ یہ لوگ اپنی ناسمجھی، کم علمی اور بے عقلی کے باعث بلندی کے بجائے پستی میں دھنس رہے ہیں اور اپنی تنزّلی کا نام انھوں نے ترقی پسندی رکھ چھوڑا ہے۔

اچھا اگر کوئی خرگوش کا ٹخنہ نکال کر اپنے پاس رکھ لے تو اس کو نظر بد نہ لگے اور نہ اس پر جادو اثر کرے۔ اونٹ کے بدن کی چیچڑی عاشق کے گریبان یا آستین میں ڈال دو اس کا عشق جاتا رہے گا۔ اونٹ کی پنڈلی کا گھی حیض سے پاک ہونے کے بعد کوئی عورت تین روز روئی یا اون میں رکھ کر اپنے پاس رکھ لے اور خاوند کے پاس جائے تو بانجھ ہو تب بھی حاملہ ہو جائے۔ اور اگر خرگوش کا خون پی لے تو حمل قرار نہ پائے۔ فندق کی لکڑی سے بچھو کے چاروں طرف حصار کھینچ دیں تو وہ نکل نہ سکے اور اگر کوئی فندق اپنے پاس رکھے تو بچھو کے کاٹنے سے محفوظ رہے۔ کیا یہ عجیب و غریب باتیں جن کی نہ کوئی عقلی توجیہہ کی جا سکتی ہے اور نہ دلیل دی جا سکتی ہے کسی حکیم و علیم ذات کو نہیں بتلاتیں؟ یہاں پر سائنس، منطق اور فلسفہ خاموش انگشت بہ دندان کیوں ہیں؟

کائنات کے اسرار میں جتنا بھی غور کیا جائے اتنا ہی وجود باری تعالےٰ پر یقین مستحکم ہوتا ہے۔ سب اسی ذات کی کار فرمائیاں ہیں۔ اپنے آپ خود بخود، آٹومیٹک یہ واقعاتِ عالم نہیں ہو سکتے۔ کہ انھیں محض اتفاق کا نتیجہ کہہ دیا جائے، کروڑوں عجائباتِ عالم ہیں جو اُسی ذات وحدہٗ لاشریک کی حکمت اور مصلحت سے وجود میں آئے ہیں۔ یہ علامات ونشانیاں اس کے وجود کے دلائل ہیں۔ غور تو کرو، ایسی ایسی عجیب باتیں بھلا خود بخود اپنے آپ کیسے ہو سکتی ہیں۔ ہمارا پاجامہ یا پتلون تو اپنے آپ سل نہیں سکتی۔ مشین بٹن دبائے بغیر حرکت نہیں کرتی۔ دوکان اپنے آپ نہیں کھلتی۔ ہوائی جہاز خود بخود نہیں اُڑتا۔ اسی طرح زمین وآسمان اور انسان کے لبس سے باہر کی کائنات اپنے آپ نہیں بنتی بنانے والے سے بنتی ہے اور اسی کے حکم سے قائم ودائم ہے جب تک وہ باقی رکھنا چاہے تب تک ہی باقی رہتی ہے۔

آپ کا بیٹا مر رہا ہے، آپ اس کے خالق ہیں تو بچا لیجیۓ۔ آپ روتے کیوں ہیں؟ کہیں خالق بھی روتا ہے؟ مشین تو موجود ہے، دس بارہ اور بنالیں اور ایسے بنائیں جو کم از کم دو سو سال تک تو جئیں۔ ایک سر پٹک رہا ہے اور ہر ایک سے دوائیں پوچھتا پھر رہا ہے کہ شادی کو بیس سال ہوگئے مگر اولاد نہیں ہوتی۔ دوسرے کو غم ہے کہ ہوتی ہے مگر زندہ نہیں رہتی، تیسرا کہتا ہے، شادی کر کے مصیبت میں آگئے، ہر سال ایک نیا ایڈیشن وجود میں آجاتا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی دوائیں استعمال کیں

تو ایک کے بجائے بیک وقت دو بچے پیدا ہو گئے کیوں جناب؟ آپ کی فرمائش کیوں نہیں چلتی؟ آپ کے ارادوں کو کون فسخ کر رہا ہے؟ ارادے ٹوٹتے رہیں مگر توڑنے والا کوئی نہ ہو؟ تمنا پوری نہ ہو سکے لیکن تمنا پوری نہ ہونے دینے والے کا وجود نہیں؟ کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ موٹر چلتے چلتے رک گئی مگر اُسے روکنے والا، چلانے والا تھا ہی نہیں کھانا خود ہی پک گیا، خود ہی نوالے بن کر آپ کے منہ میں پہنچ گئے اور آپ کو کچھ کرنا ہی نہیں پڑا۔؟ دوکان کھلی مگر کھولنے والا کوئی نہ تھا؟ سودا بکتا رہا لیکن بیچنے والا نہ آدمی تھا نہ مشین اور نہ کوئی گاہک آیا۔ جب یہ کام از خود نہیں ہو سکتے تو دنیا کے عجائبات خود بخود کیسے ہو گئے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے، تاثیر پیدا کرنے اور قدرت کا اظہار کرنے والا کوئی نہیں ہو۔ ماننا پڑے گا کہ انسان پہ اور تمام کائنات پر تصرف کرنے والی کوئی قادر مطلق ہستی ضرور ہے۔ انسان خود خالق نہیں۔ انسان پر اور مادّہ پر اور قوّت پر ایک خالق کُل ذات موجود ہے۔

جس کا ماننا عین عقل و دانش اور نہ ماننا خلافِ عقل بلکہ دیوانگی ہے۔

ذرا مرغی کے بچوں پر نظر ڈالئے، انڈے سے باہر آتے ہی کس طرح اپنی ماں کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں، باہر آتے ہی سب دانے کھاتے ہیں، نہ کنکری اور نہ درختوں کے پتے۔ انھیں کس نے بتایا کہ یہ تمھاری خوراک ہے۔ پیاس لگی تو کس نے کہا کہ پانی سے پیاس بجھتی ہے اور پانی یہ ہے۔ ان بچوں کے پانی پینے کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ان سے کس نے کہا کہ چونچ میں پانی بھر لو۔ پھر منہ اوپر کرو۔ پانی تمھارے حلق میں اُتر جائے گا۔ ایک انڈے کو توڑ کر دیکھئے۔ سفیدی

الگ، زردی الگ، حالانکہ باہم ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ کچھ دن بعد توڑیئے تو زردی کی بجائے خون نظر آئے گا، پھر اُسی انڈے میں پورا پرندہ چلنے پھرنے اُڑنے والا کس نے بنایا؟ انڈے سے باہر آکر بچّے کس طرح دانے پر لڑتے ہیں، کبھی وہ لے گیا۔ کبھی وہ لے بھاگا۔ یہ فطرتِ الٰہیہ اور خالق اکبر کی رہنمائی نہیں تو اور کیا ہے۔ چیونٹی انڈا آج دیتی ہے اور زمین کی گود پہلے ہی تیار ہے کہ بچہ آئے اور میں اُسے آغوش میں لے لوں، خوراک پہلے سے خالق ورزّاق نے پیدا کر رکھی ہے۔ چیونٹی تو صرف خوراک لانے اور کھلانے پر مقرر صحیح مگر وہ خود خالق ورازق نہیں ہے۔ کیا یہ سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے بعد بھی حقیقی خالق ورازق کا انکار کیا جا سکتا ہے قادرِ مطلق کی قدرت کو دیکھ کر بھی اُسے نہ ماننا جہالت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ خدا ایسے جہلا کو ہدایت دے۔ یہ تو ابوجہل کے بھی ابّو ہیں کہ وہ بُت پرستی میں مبتلا ہونے کے باوجود وجود باری تعالیٰ کا تو قائل تھا۔ دہریئے کم بخت تو قائل ہی نہیں۔ آنکھیں دیکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ دیکھنا نہیں چاہتے۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تو ہمیں ایک بار پھر شمیم اختر یاد آنے لگے۔ وہ موجود ہوتے تو ان باتوں کو سن کر کتنا خوش ہوتے اور شاید وجود باری تعالیٰ پر اتنی ہی مثالیں خود بھی بیان کرتے۔

باب ٦

سفر سے واپس ہوتے ہی شمیم اختر غریب خانہ پر آپہنچے۔ ہم نے پُرتپاک خیر مقدم کیا اور بیٹھک کی جانب بڑھتے ہوئے انھیں بتایا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کی کمی کس حد تک محسوس کی گئی۔ بیٹھک پر پہنچ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور انھوں نے بھی یہی کہا کہ وہ ہمیں برابر یاد کرتے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک سفر اور گھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ دین کی چسک جسے لگ جائے اُسے سب کچھ ہیچ نظر آنے لگتا ہے، اور دل یہی چاہتا ہے کہ بس ایک ہی تذکرہ ہو۔ ایک ہی محبوب کی باتیں ہوں۔ اسکی لذّت صرف وہی جان سکتے ہیں جنھوں نے محبّت کی شراب چکھی ہو۔ دوسروں کو اس لذّت اور سواد کا کیا پتہ؟ شمیم اختر نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خداوند کریم کا ذکر چھیڑ دیا لیکن اس بار انھوں نے بہت ہی انوکھا سوال کیا۔ پوچھنے لگے: "بھائی! دلائل کے ساتھ تو یہ بات دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی کہ بیشک اللہ کی ذات ہے، ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ وہ پاک ذات موجود رہے گی۔ اسی کے حکم اور اسی کی حکمت سے یہ عالم وجود میں آیا اُسی کے حکم و حکمت سے یہ عالم

فنا ہو گا۔ ہم بے شک اس قابل نہیں کہ اُسے دیکھ سکیں یا اُس سے بات کریں مگر کیا دنیا میں ایک بھی انسان ایسا نہیں ہے جس نے اُسے دیکھا ہو اور اُس سے گفتگو کی ہو؟"

ہم نے کہا: "جناب، ایک دو نہیں، سو دو سو نہیں، ہزار دس ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش اتنے ہی انسانوں نے اس سے باتیں کی ہیں۔ یہ وہ عظیم انسان ہیں جو ساری زندگی ایک لمحہ کے لئے جھوٹ نہ بولے۔ پاکباز، فرشتہ سیرت، عمل و کردار میں یکتائے روزگار، انسانوں کے ہمدرد، دل سے خیر خواہ، ناتواں اور کمزوروں کے دکھ درد میں کام آنیوالے صادق و مصداق، ہر کمال و خوبی میں سارے انسانوں سے افضل، زبان ان کی تعریف سے قاصر ہے۔ ان کی زندگیاں ان کی عظمت و بزرگی کی شاہد ہیں۔ ان کے دشمن ان کی امانت اور صدق کی گواہی دیتے ہیں، یہ حضرات خدا کے نبی اور رسول ہیں۔ جنھوں نے اپنی ذات اور اپنے نفس تک کے لئے کبھی کبھی ایک لحظہ غلط بات نہ کہی ہو۔ وہ بھلا خدا کے متعلق غلط بیانی کیسے کر سکتے ہیں۔ ان سب حضرات کا کہنا ہے کہ ہم نے خدا سے باتیں کیں، ہمارے پاس خدا کا فرستادہ فرشتہ خدا کے پیغام لاتا ہے۔ ہمارے آخری پیغمبر جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج شریف میں خدا سے باتیں کیں اور اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا ہے اور دیدار کے بعد بہت کچھ ہمیں بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مرنے کے بعد قیامت ہو گی، سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے، فرمانبردار انعام پائیں گے، اور جنت میں داخل ہوں

گے ، نافرمان بندے عذاب دوسرا بھگتنے کے لئے دوزخ میں جائیں گے۔ جنتیوں کو جنت میں پہنچکر اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا یعنی جنت والے بھی اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے، یہاں دنیا میں انھوں نے اپنی حکمت سے ہماری آنکھوں میں قوت نہیں دی جس کی وجہ سے ہماری آنکھوں میں نقصان، کمی اور کمزوری ہے کہ یہاں دیکھنے سے قاصر ہیں، جنت میں قوت دے دیں گے۔ تو ان کو سارے جنتی بھی دیکھ لیں گے۔ اسی کو دیدار الٰہی کہتے ہیں "۔

شمیم اختر نے کہا: "اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ہمارا ان سب باتوں پر ایمان کامل ہے، لیکن مغرب زدہ نام نہاد ترقی پسند دہریئے ان باتوں کو کب تسلیم کرتے ہیں۔ آخر انھیں کیا کہہ کر قائل کیا جائے؟"

ہم نے کہا: "یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جو شخص کچھ سوچنا اور سمجھنا نہ چاہے، اُسے اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتے۔ ہاں، اگر کسی کو طلب صادق ہو تو یقیناً ہدایت مل جاتی ہے۔ عقلمند کو سمجھانے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ دنیا کی عدالت یا پنچایت میں دو گواہ کوئی بات کہہ دیں تو وہ تسلیم کر لی جاتی ہے اور جس بات کی شہادت کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پاکباز انسان دے رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ ہم نے خدا سے بات کرنے کا شرف حاصل کیا ہے اور اُسے دیکھا بھی ہے، بھلا اس بات کا یقین کیوں نہیں کیا جائے گا۔ منکر صرف اندازے، ظن وگمان سے انکار کرتا ہے مگر انبیائے کرام علیہم السلام کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے باتیں کی ہیں، ان کے پاس ہو کر، ان کو دیکھکر آئے ہیں، اور پھر سب کے سب ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ اتنی

پختہ بات کو نہ ماننا سوائے بدفہمی و عناد یا خواہشات کی اتباع کی رو میں تکذیب کیئے جانے کے سوا کیا ہو سکتا ہے"؟

"معاف کیجئے گا" شمیم اختر نے کہا: "دہریئے یہ کہہ کر آپ کی بات کو رد کر سکتے ہیں کہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انسان اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کی شہادت دیتے ہیں تو آپ آنکھیں بند کر کے ان کی بات مان لیتے ہیں لیکن ہم ایسے کروڑوں انسان گنوا سکتے ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے گفتگو نہیں کی، اب بتلائیے لاکھوں کے مقابلے میں کروڑوں کی بات مانی جائے گی یا نہیں؟"

ہمیں شمیم اختر کے سوال پر ہنسی آگئی، ہم نے ہنستے ہوئے کہا: "جواب تو بعد میں دیں گے، پہلے ایک لطیفہ سن لیں۔ عدالت میں ایک عادی مجرم کو پیش کیا گیا۔ اُس پر ایک دوکان سے گھڑی چُرانے کا الزام تھا۔ دس گواہ ایسے تھے جنھوں نے اُسے اپنی آنکھوں سے گھڑی چراتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر ملزم بڑا ڈھیٹ تھا۔ عدالت میں اپنے جرم سے صاف مُکر گیا۔

جج نے کہا: "تمہیں دس آدمیوں نے چوری کرتے ہوئے دیکھا پھر بھی تمھیں جرم کا انکار کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

چور بولا "حضور! دس آدمیوں کی گواہی پر آپ مجھے مجرم سمجھ رہے ہیں حالانکہ میں ایسے ایک لاکھ آدمیوں کی گواہی دلا سکتا ہوں جنھوں نے مجھے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا"۔

بولیئے۔ آپ دس کے مقابلہ میں ہزار آدمیوں کی بات ماننے کے لئے تیار ہیں؟"

ہے تو لطیفہ، لیکن غور کیجئے تو کتنی اہم گتھی اس لطیفے سے سُلجھ جاتی ہے۔ کیا جج اسکی بات مان کر اُسے سزا نہیں دے گا؟ یقیناً سزا دے گا۔ کیونکہ موقعہ واردات پر ہزاروں بلکہ کروڑوں آدمیوں کا یکجا ہونا ممکن نہیں اس کے علاوہ دیکھنے والوں کا بیان یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔ جب کہ نہ دیکھنے والوں کی بات میں پختگی نہیں ہوتی۔ ظن و تخمین کے غلط حیلے بہانوں کے علاوہ کوئی مضبوط یقینی دلیل انکار کی نہیں ہوتی۔ بس یہی جواب ہے آپکے سوال کا۔ اگر دہریئے آپ سے جہالت کا یہ سوال کریں تو ان سے صرف اتنا پوچھ لیں کہ کروڑ کے مقابلہ میں جج صرف دس آدمیوں کی گواہی کیوں تسلیم کر لیتا ہے؟ اگر وہ دس کی گواہی تسلیم کر سکتا ہے تو ہم بھی کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار صادق و مصدوق انسانوں کی گواہی کو کروڑوں کی گواہی کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں اور دل سے امنّا و صدقنا کہتے ہیں۔"

باب

هم چار یار۔ چلے بازار۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے وہی شمیم، تیسرے نسیم اور چوتھے ہم وسیم۔ راہ میں بڑی دلچسپ بحث چھڑی، ایک کہے میں بڑا، دوسرا کہے میں بڑا، ابھی یہ ہنسی مذاق کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میاں کلیم آتے ہوئے نظر پڑے۔ اُنھوں نے آتے ہی دو ٹوک فیصلہ سُنا دیا کہ اصل بڑے تو ہم ہیں۔ مذاق ہی مذاق میں جھگڑا بڑھ گیا۔ تو تو میں میں ہو گئی۔ ایک بولا: "ہم لوگ خواہ مخواہ جھگڑا کر رہے ہیں، گھر چلو بانس سے ناپ لیتے ہیں کہ کون بڑا ہے۔"

سلیم نے کہا: "ارے میاں قد کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ بحث یہ ہے کہ ہم میں اُونچا کون ہے؟"

ہم بھی خاموش نہ رہ سکے۔ دوستوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، "اچھا تو جو شخص اُونچا بننا چاہتا ہے وہ اپنا ہاتھ اُٹھائے۔ ہم اُسے بانس پر بٹھا کر اونچا بنا دیں گے۔"

سلیم بولے: "تم تو بچوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا بانس پر کوئی آدمی بیٹھ سکتا ہے۔"

ہم نے کہا: "کیوں نہیں۔ بالش کو کاٹ کر اسکی ٹیک بنا لی جائے گی۔ پھر بیٹھنا بھی آسان اور اونچا بننا بھی آسان۔"

"ارے بھائی۔ آپ سمجھے نہیں۔" شمیم اختر نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا "مطلب یہ ہے کہ کس کی عزت زیادہ ہے۔ معاشرے میں کون بڑا شمار ہوتا ہے۔"

کلیم بولے: "ایسی بڑائی میں کیا رکھا ہے۔ بھوک میں کھانا اور پیاس میں پانی نہ ملے تو نانی اماں یاد آجائیں۔ بس رہنے دو۔ بڑائی تو جس کے لئے ہے اسی کو زیبا ہے۔ فضول بحث چھوڑو۔ ہمارے گھر چل کر گرم گرم چائے کی ایک ایک پیالی پیو۔ بازار میں گھوم کر وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ میں مسٹر اے قدیر کو بھی چائے کی دعوت دے آیا ہوں۔"

ہم نے پوچھا: "یہ مسٹر اے قدیر کون ہیں؟"

بولے: "عبدالعلیم صاحب کے بیٹے ہیں۔ اچھے خاصے اخلاق اور اخلاص کے مالک تھے مگر خدا غارت کرے اس سوسائٹی کو ان کا ناس کر دیا۔ نام نہاد ترقی پسندوں میں اٹھ بیٹھ ہو گئی۔ وہ تو ادھر ادھر کی ہانکتے ہی رہتے ہیں۔ مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں اس لئے اس کو قید و بند سے تعبیر کرتے۔ اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر دہریت کی گپیں ہانکتے ہیں یہ بے چارے ان میں بیٹھے تو اسی سانچے میں ڈھل گئے۔ پہلے عبدالقدیر تھے لیکن شاید خود کو عبد کہتے ہوئے شرم آئی۔ عبدالقدیر سے اے۔ قدیر بن گئے۔"

شمیم اختر تو اللہ دے اور بندہ لے کے مصداق ہیں، اچھل کر بولے، "تب تو تمہارے دوست اے قدیر سے اس موضوع پر ضرور گفتگو

ہوگی۔ شاید ہمارے سمجھانے بجھانے سے اللہ تعالیٰ ان کو راہِ راست پر لے آئیں اور اسی بہانے ہماری نجات بھی ہو جائے"۔

سلیم نے کہا "نہیں یار ان کا راہ پر آنا مشکل ہے۔ پتہ چلا ہے کہ وہ جس اسکول میں پڑھتے تھے وہاں کے دو تین ماسٹر بھی ایسے ہی تھے۔ انھوں نے اپنے مطلب کی کتابیں اور رسالے انھیں پڑھوائے اور گھر بلا کر تعلیم کے بہانے ایسی ہی ریشہ دوانیاں کیں۔ عبدالقدیر انسان ہی تو ہیں۔ کب تک اپنے بڑوں کی سحر بیانی میں نہ آتے۔ پھر گئے۔ بیان میں بھی جادو ہوتا ہے۔ اسی لئے تو بزرگوں نے کہا ہے کہ انسان کبھی بری صحبت میں نہ جائے"۔

"اچھا۔ آپ لوگ یہیں کھڑے باتیں بنائے جائیں گے؟" ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ میاں کلیم اپنا ارادہ منسوخ کر دیں یا مسٹر اے۔ قدیر ان کے گھر آکر واپس ہو جائیں"۔

بھاگم بھاگ ہم لوگ کلیم کے یہاں پہنچے۔ بیٹھک میں کرسیاں اور صوفے سلیقہ سے لگے ہوئے تھے۔ فرش پر بیش قیمت ایرانی قالین بچھا تھا۔ الماریاں ضروری سامان تعیش سے بھر پور تھیں۔ ہم لوگوں نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی اور لگے کلیم سے چائے کا تقاضہ کرنے۔ اسی دوران مسٹر اے قدیر بھی آگئے۔ نہ سلام نہ کلام، نہ منہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں، چہرے سے غرور و تمکنت عیاں، آنکھوں سے ہمارے لئے حقارت ٹپکتی ہوئی۔

شمیم نے ایک جملہ کسا "کیوں بھئی کلیم! ما چون دیگرے نیست کا کیا مطلب ہے؟" کلیم سیدھے سادھے آدمی، یہ نہیں سمجھے کہ مسٹر اے۔ قدیر پر

طنز کیا جا رہا ہے۔ کہنے لگے :

" یہ فارسی کا مقولہ ہے۔ مغلوں کے دور میں فارسی سرکاری زبان تھی۔ دوسرے مذاہب والے بھی اُسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ زبان قصّۂ پارینہ بن چکی ہے۔ مطلب اس مقولہ کا یہ ہے کہ ہم جیسا عاقل و دانا دنیا میں دوسرا کوئی شخص ہے ہی نہیں، عام طور پر ایسے مغرور اور متکبّر لوگوں کے لئے جو اپنے سامنے سبھی کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں، بولا جاتا ہے "۔

ہمیں ڈر معلوم ہوا کہ شمیم اختر کی بات سے تلخ کلامی تک نوبت نہ پہنچ جائے اور مسٹر اے قدیر لڑنے مرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس لئے جلدی سے بولے "۔ مقولے تو پھر بھی سمجھے جا سکتے" ہیں۔ ہم لوگ یہاں کسی دوسرے ارادے سے آئے ہیں۔ خواہ مخواہ قیمتی وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ ؟ وقت گزر جائے تو ایک منٹ کی واپسی کے لئے ایک لاکھ روپے بھی دینا چاہیں، تب بھی نہیں ملے گا۔ جو ضائع ہو گیا، وہ ہو گیا۔ جو کسی کام میں گزرا، وہ کام آیا کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گیا وقت ہاتھ آتا نہیں ٭ سدا دور دورہ دکھاتا نہیں

" حقیقت بھی یہی ہے۔ وقت یکساں نہیں رہتا"، شمیم نے کہا: " بنتی بگڑتی رہتی ہے اور جب بگڑتی ہے تو ایسی بگڑتی ہے کہ دن کو تارے نظر آجاتے ہیں۔ عقل تک خراب ہو جاتی ہے"۔

" اچھا عقل بھی خراب ہو جاتی ہے ؟" ہم نے پوچھا۔ " پھر تو جو چیز

خراب ہو جائے؟" اس کا کیا اعتبار؟ کیونکہ معلوم نہیں کس وقت یہ خراب ہو جائے اور ہم غلطی سے اُسے اچھا ہی سمجھتے رہیں۔ بھئی جس چیز کے کل پُرزے خراب ہو جاتے ہیں اور ہمارے اختیار میں نہ ہوں اس چیز کو یقین کا معیار کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی آدمی کسی کے بارے میں یہ کہے کہ عقل میں آئے تب ہی مان سکتا ہوں، ہم پوچھیں گے کہ کیوں صاحب آپ کی عقل خراب ہو رہی ہے تو؟ کسی خراب شدہ برتن میں اچھی چیز کیسے آسکے گی۔ ظاہر ہے کہ ڈالنے والے کو بیوقوف ہی کہا جائے گا۔ کہ ایک اچھی بھلی چیز کو بھی خراب کر رہا ہے ع خرکہ درکانِ نمک رفت، نمک شُد۔ آپ کہیں گے یہ کیا کہہ دیا۔ یہ وہی قصۂ پارینہ والی زبان ہے مگر ہم کو پیاری ہے۔ پسند اپنی اپنی شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ گدھا نمک کی کان میں جا پڑا تو نمک ہی بن جائے گا۔ اسی طرح جب عقل خراب ہو تو وہ اچھی بات کو بھی خراب ہی سمجھے گی۔ عقل کو معیار بنانا صحیح نہیں ہے۔

انسان بولتا رہتا ہے، کھاتا پیتا رہتا ہے مگر عقل پھر بھی خراب ہو جاتی ہے، میں کسی پاگل شخص کی عقل کی بات نہیں کر رہا ہوں، میرا مطلب ایسے لوگوں کی عقل سے ہے جنھیں پڑھا لکھا، ذہین اور سمجھدار کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہی خاندان میں میاں جمال کے والد پچاس ہزار نقد چھوڑ کر مرے تھے۔ ان کے مرتے ہی میاں جمال نے الللّے تللّے شروع کر دیئے اور دونوں ہاتھوں سے دولت کو اُڑانے لگے۔ دوستوں عزیزوں نے بہت اونچ نیچ سمجھائی۔ مگر کیا مجال؟ کسی ایک کی نہ سُنی، اپنی ہی ہانکتے رہے اور رقم فضول خرچیوں میں ضائع کرتے رہے آخر سب نے یہی کہا کہ ان کی عقل خراب ہو گئی ہے۔ اُنھیں کچھ

سمجھانا بجھانا بے کار ہے، آخر سارا خاندان اور سارے جاننے والے غلط بات تو نہیں کہہ سکتے۔ دراصل یہ بھی ایک قسم کی عقل کی خرابی کہلاتی ہے۔ اور بھی عقل نہ جانے کہاں کہاں خراب ہوتی رہتی ہے۔ اچھا خاصہ آدمی خوبصورت بیوی بچے اور مٹا ہوا ہے کسی بازاری عورت پر۔ کیا اسے عقل کی خرابی نہیں کہیں گے؟ مانا کہ عقل ایک بڑی اچھی قوت ہے مگر اسی حد تک جب تک اپنے جامے میں رہے حدود سے ذرا بھی تجاوز کیا اور یہ بگڑی؟ جو لوگ کہتے ہیں کوئی بات عقل میں آئے، تب مانیں گے، انھیں چاہیئے کہ پہلے اپنی عقل کو کسی سیانے کو دکھلائیں کہ خراب تو نہیں ہے۔ صاف اور ظاہری بات کو نہ ماننا بھی عقل کی خرابی کہلاتی ہے۔ سیدھی بات کے بجائے الٹی بات کو تسلیم کرنا بھی اسکی خرابی ہے دو آنے روز کا مزدور اور دور وپے روز کا خرچ لگالے تو اس کی عقل خراب نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے ورنہ دن رات عقل کی خرابی کا رونا ہر طرف سننے میں آتا ہے۔ اکثر ایسے لوگوں کو سر پکڑے بیٹھے ہوئے دیکھا ہے جو بزبانِ حال یہ کہہ رہے تھے:

"بھائی میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے!" "میری عقل کو خدا جانے کیا ہو گیا تھا؟" "میری تو عقل کام نہیں کرتی"۔ فلاں معاملہ میں میری عقل جاتی رہی"۔ اور یہ بات تو مسٹر اے۔ قدیر بھی مانیں گے کہ عقل معیار نہیں ہو سکتی۔ سننے میں آیا ہے کہ غلط لوگوں کی صحبت میں ان کے خیالات کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اور یہ حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے اپنی عقل کی کسوٹی پر کستے اور پرکھتے ہیں"۔ مسٹر اے قدیر بہت توجہ لیکن حقارت کے ساتھ ہماری بات

سن رہے تھے۔ جونہی ہم خاموش ہوئے وہ زہر خند کے ساتھ استہزائیہ انداز میں بولے: "گھما پھرا کر بات کیوں کرتے ہو، صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم خدا کے بارے میں ہماری رائے معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

ہم نے کہا: "بے شک ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی عقل کا فیصلہ کس حد تک دانشمندانہ ہے"۔

وہ ہنس کر کہنے لگے: "ہمارا خیال یہ ہے کہ خدا کا وجود فرضی ہے اور اس فرضی وجود کے بارے میں اربابِ مذاہب کے خیالات علم و فن سے ناواقفیت اور کوتاہ فہمی پر مبنی ہیں، زمانۂ حال کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ ساری سماوی اور ارضی اشیاء کی اصل دو چیزیں ہیں۔ ایک مادّہ اور دوسری اسکی قوت بالفاظ دیگر مادّہ کی حرکت۔ یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے موجود ہیں۔ مادّہ اور اس کی حرکت میں جدائی ہونا ناممکن ہے۔ مادّہ سے میری مراد وہی دیمقراطیسی اجزاء ہیں جو اس خلا میں بھرے ہوئے ہیں اگرچہ وہ ذہنی تقسیم قبول نہیں کر سکتے لیکن خارجی تقسیم کی بھی ان میں گنجائش نہیں۔ ان ذرّات کو ایتھر کہتے ہیں اور ان کی دوامی حرکت سے اجرامِ سماوی یعنی ستارے اور کائناتِ ارضی مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات جو پہلے سے موجود نہ تھے وجود میں آ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ وجود میں آنے کا یہ عمل خود بخود ہوا کیونکہ مادّہ اور اسکی حرکت کو نہ کسی قسم کی سمجھ ہے اور نہ ادراک ان میں کسی بات کا ارادہ یا قصد بھی نہیں پایا جاتا۔ اس لئے خود بخود مادّے اور اسکی حرکت سے یہ تمام عالم وجود میں آ گیا اور سب چیزیں از خود بنتی

چلی گئیں۔ جب ہم تمام مخلوقات کے وجود کو مادّے اور اسکی حرکت سے منسوب کر سکتے ہیں تو ہم کو کیا ضرورت ہے کہ آپ کے فرضی خدا کو مانیں۔ آپ کی طرح ہم مذہبی طوق و سلاسل میں پھنسنا نہیں چاہتے ہمیں اپنی ہی فکریں کونسی کم ہیں جو فرضی خدا کے فرضی عذاب و ثواب کا غم اور بڑھا کر اپنی زندگی کو اجیرن بنالیں ہمارے نزدیک مادّہ بھی قدیم ہے، گو صورتِ شخصیہ الگ الگ حادث ہے۔ مگر اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ہم خدا کو فرض کرنا شروع کر دیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم کو خدا کے وجود کی اصلاً ضرورت نہیں۔ مادّہ اور حرکت ہی عالم کی ہستی اور بقاء کی ضمانت ہیں۔ اور جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا، یہ سارا عالم اسی مادّے اور حرکت ہی سے خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ تعجّب ہے لوگوں کی عقلیں اتنی موٹی کیوں ہو گئی ہیں کہ معمولی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے"۔

شمیم چہکے "اچھا جناب۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ مادّہ اور حرکت کا خالق کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں"۔ مسٹر اے۔ قدیر نے اپنی فلاسفی بگھاری "یہ دونوں خود بخود پہلے سے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اسباب کو قدیم کہتے ہیں یعنی جو کسی کے پیدا کرنے سے پیدا نہ ہو بلکہ از خود ہمیشہ ہمیشہ سے ہو۔ اسی کو قدیم کہا جا سکتا ہے"۔

"بہت خوب۔" شمیم اختر نے مسکراتے ہوئے کہا: "آپ مادّے اور اسکی حرکت کو اسی عالم کے وجود کا سبب گردانتے ہیں اور بقول آپ کے یہ دونوں خود بخود ہمیشہ سے ہیں، ان کو کسی نے پیدا نہیں کیا اور ہم یہ کہتے ہیں

کہ خدا کی ذات ہمیشہ سے ہے اور اسی نے ساری کائنات اور اسکی اشیاء کو پیدا کیا۔ اب آپ خود ہی انصاف کیجئے کہ ہم نے کونسا پہاڑ ڈھا دیا؟ آپ ایک مخلوق کو قدیم مانتے ہیں اور ہم خالقِ کائنات کو قدیم مانتے ہیں۔ ماننا تو آپ کو بھی پڑتا ہے اور ہمیں بھی۔ گویا کچھ نہ کچھ ہے ضرور، جس کو مانے بغیر چارۂ کار نہیں۔ مادّہ کا قدیم ہونا آپ نے مان لیا۔ کیا اس وقت آپ موجود تھے، جب مادہ محض مادّہ ہی تھا اس میں حرکت کس نے پیدا کی؟ دراصل آپ کے ماننے کی بنیاد ریت پر رکھی گئی ہے۔ ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ پہلے صرف مادّہ تھا پھر کہتے ہیں کہ بعد میں اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ گویا آپ نے یہ تسلیم کر لیا کہ مادّہ کی حرکت قدیم نہیں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"جی ہاں، اس حد تک تو آپ درست فرما رہے ہیں۔" انھوں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

شمیم اختر بولے۔" بس یہیں آپ کا ریت پر بنا ہوا محل دھڑام سے گر گیا۔ دیکھئے بقول آپ کے مادّہ تھا لیکن حرکت بعد میں پیدا ہوئی اور یہ حرکت آپ کے خیال کے مطابق یقیناً مادّہ نے پیدا کی ہو گی؟"

"بیشک۔"

"مگر مادّہ بغیر حرکت کے کچھ تخلیق نہیں کر سکتا۔ آپ ہی کا کہنا ہے کہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

(۱) مادّہ اور

(۲) مادّہ کی حرکت

سوال یہ ہے کہ مادّہ نے حرکت کی موجودگی کے بغیر حرکت کو کیسے پیدا کیا؟"

مسٹر اے۔ قدیر گبھرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ فرار ہو جانا ہی مناسب ہے۔ میاں کلیم نے مترنّم آواز میں یہ مصرعہ پڑھ دیا ع

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

بس مسٹر اے قدیر تو بگڑ ہی گئے۔ پورا چہرہ سُرخ ہو گیا آنکھیں نکال کر بولے: "تم لوگوں کو بحث کرنے کے آداب بھی نہیں معلوم۔ مذہب کی غلامی تمھیں کو مبارک ہو۔ ہم تو آزاد پیدا ہوئے ہیں اور آزادانہ ہی زندگی گزار دیں گے۔ تمھاری طرح ہماری ذہنیت غلامانہ نہیں ہے"۔

شمیم اختر کہنے والے تھے کہ یہ تو ہمارے سوال کا جواب نہیں ہوا۔ یا تو آپ یہ تسلیم کریں کہ مادہ اور اسکی حرکت والی تھیوری سرے سے ہی غلط ہے یا یہ کہیں کہ دونوں چیزیں قدیم نہیں ہیں۔ مگر کلیم نے آنکھ کے اشارے سے انھیں منع کر دیا اور مسٹر اے قدیر کو مخاطب کر کے کہنے لگے: "آپ کا خیال یہ ہے کہ مذہب قید اور غلامی ہے اور آپ بالکل آزاد ہیں؟ حالانکہ مذہب کی طرح لا مذہبیّت اور دہریت بھی تو ایک قید ہے۔ مذہب کا مطلب راستے اور طریقِ کار سے ہے۔ ہر شخص زندگی گزارنے کا ایک طریقِ کار رکھتا ہے، ایک نظریہ رکھتا ہے۔ اسی طریقۂ کار اور زندگی گزارنے کے نظریئے کو مذہب کہتے ہیں۔ خواہ وہ آسمانی طریقۂ کار ہو اور خواہ اپنا گڑھا ہوا خیالی نظریہ۔ اسلام ہو یا نصرانیت یا دہریت۔ ہر ایک کا ایک نہ ایک نظریہ

ہے۔ ایک نہ ایک مذہب ہے۔ اگر آپ صرف اسلام کو مذہب کہتے ہیں تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ عیسائیت بھی مذہب ہے، ہندو دھرم بھی مذہب ہے، اور دھریت بھی مذہب ہے۔ یعنی غلامی اور قید و بند سے آزاد نہیں۔ آپ کے نزدیک ہم نماز کی قید میں ہیں تو ہمارے نزدیک آپ سینما اور فلم کی قید میں گرفتار ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مسجد میں لائن نہیں لگتی۔ فلم میں لائن لگانا پڑتی ہے مسجد میں جانے والوں کو دھتکارا نہیں جاتا۔ فلم میں سیٹیں پوری ہو جائیں تو کتّے کی طرح جھڑک کر آپ کو بھگا دیا جاتا ہے۔ مسجد میں پیسہ خرچ نہیں ہوتا۔ فلم میں پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ اور وقت بھی۔ ہم جمعہ کے جمعہ خط بنوانے کی قید میں ہیں تو آپ اپنے کو آزاد کہنے والے روزانہ شیپ کی قید میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سوٹ پہن کر بیٹھنے اُٹھنے کے راستے تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ یہ خیال رکھنا ہوتا ہے کہ کہیں شکن نہ پڑ جائے، سلوٹ نہ آجائے، کریز نہ ٹوٹ جائے۔ کبھی امریکی فیشن کی قید اور کبھی برطانوی فیشن کی قید۔ ہر وقت قید ہی قید ہے۔ کھانے تک میں جب دوسری اقوام کی نقل اور تقلید کی جائے تو اُسے قید نہیں تو اور کیا کہیں گے؟ ہاں اگر آپ لوگوں کو کوئی آزادی ہے تو صرف اتنی کہ اپنی مرضی سے جس قید میں مقیّد ہونا چاہو، ہو جاؤ۔ مسلمان کی طرح نہیں کہ ایک اللہ کو مان لیا اور ساری زندگی اسی کا ہو رہا۔ نظرِ انصاف سے دیکھئے تو مسلمان صرف ایک ہی راہ کا راہرو ہے۔ وہ آپ سے کہیں زیادہ آزاد ہے اور ایک کی غلامی دس بیس کی غلامی سے زیادہ آسان ہوتی ہے۔"

مسٹر اے۔ قدیر پے در پے حملوں سے بوکھلا چکے تھے۔ چہرے سے

برہمی صاف عیاں تھی۔ چاہتے تھے کہ کچھ کہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہا جائے؟ نظریں بار بار دوازے کی طرف اٹھتی تھیں اور بے نیل وسرام واپس لوٹ آتی تھیں، ہم سب ان کی بے چینی سے دل ہی دل میں، محظوظ ہو رہے تھے۔ شمیم اختر بظاہر ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

" مادّہ پرستوں نے بزعم خود کائنات کے وجود کا ایک خاص سبب مقرر کر لیا ہے لیکن ابھی تک جس منتظم اور مرتب کائنات کی ذات کی تلاش تھی، اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی انھوں نے ہمیں ایک نہایت علیم و حکیم اور ہمہ صفات سے موصوف خدا سے علیحدہ کر کے ایک ایسے مادّہ پر قناعت کرنے کی رائے دی جو بالکل اندھا، بہرا، بے لبس، بے حس اور بے شعور ہے۔ جس کا کوئی کام قصد اور اختیار سے نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ مصنوعات میں کسی قسم کی ترتیب و تناسب پیدا کرنے پر قادر ہے۔ نہ اس میں سمجھ کا مادّہ ہے، نہ وہ کسی قاعدے، قانون اور اصول سے واقف ہے۔ نہ اُسے امور انتظامیہ کی اطلاع ہے۔ حالانکہ کائنات کے جس فاعل مختار کا ہم کو کھوج لگانا ہے، وہ کائنات بذاتِ خود ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے ہر ہر جز میں بیش بہا حکمتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ جس کے عجیب و غریب اسرار کا مشاہدہ کرتے ہوئے انسانی عقل تھک جاتی ہے اور جس کے تھوڑے سے حصّہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد مادّہ پرست محققین یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مظاہرِ قدرت کی جس قدر باریکیاں ہم کو اب تک معلوم ہوئی ہیں، وہ ان سب سے بہت ہی کم ہیں جو ابھی تک معلوم نہیں ہوسکیں۔ علمِ تشریح، علمِ افلاک، علمِ حیوانات، علمِ نباتات اور

علم طبقات الارض کے ماہرین سے دریافت کرو کہ جو رازہائے قدرت تم نے اس عالم کے موجودات میں دریافت کئے ہیں، وہ کس قدر ہیں اور ان کے لکھنے کے لئے کتنے دفتر اور کتب خانے درکار ہیں؟ کیا یہ خانہ زاد ہو سکتے ہیں؟ انھیں اندھے، بہرے اور مجبور ولاچار مادّے کی اندھی لاٹھی کا کارنامہ کہا جائے یا کسی صاحب حکمت ذات کی کارفرمائی؟

اس عالم کائنات کے احوال میں جو تفاوت ہے، اس پر بھی غور کرو۔ ان میں کس قدر حاجت مندی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ہر ہر شئے کی پستی و ذلت ایک پُر حکمت، صاحب جبروت خالق کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ ذرا گہری نگاہ ڈالو، بے اختیار کہہ اٹھو گے کہ یہ کارخانہ بے جوڑ اور محض اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے۔ اپنے آپ پیدا ہونے والی چیز اتنی منظم نہیں ہوتی۔ یقیناً یہ سب کسی کے تابع فرمان ہیں۔

آسمان، چاند، ستارے کسی ایک حال پر برقرار نہیں۔ کبھی عروج کبھی زوال، کبھی طلوع، کبھی غروب، کبھی نور، کبھی گہن۔ آگ ہے تو بے قرار، تھامے نہیں تھمتی۔ ہوا کا یہ حال کہ کبھی حرکت، کبھی سکون۔ اس کا رُخ کبھی شمال، کبھی جنوب، ابھی مشرق تو ابھی مغرب۔ ماری ماری پھرتی ہے۔ زمین کو دیکھو تو پستی کے ساتھ لاچار ہے۔ کوئی اس پر دوڑتا بھاگتا ہے۔ کوئی اُسے کھودتا ہے، کوئی اس پر فصلیں اُگاتا ہے اور کوئی محل بناتا ہے۔ نباتات کبھی چھوٹے ہیں تو کبھی بڑے، کبھی تر کبھی خشک۔ ایک ہی زمین ایک ہی آفتاب اور ایک ہی پانی ہونے کے باوجود اس قدر مختلف پھول، پھل آتے ہیں کہ ایک دوسرے

سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتا۔ ایک نظرِ حیوانات خصوصاً حیوانِ ناطق یعنی انسان پر ڈالو۔ ہر شخص عناصرِ اربعہ مٹی، ہوا پانی اور آگ سے مرکّب ہے مگر شکل و عادات اور خاصیّتِ مزاج میں اتنا مختلف کہ حدِ ادراک سے باہر۔ پھر اس اشرف المخلوقات میں بھوک پیاس، صحت و مرض، سردی و گرمی، حرص و ہوا نے ایسا غلبہ پایا کہ شرفِ حیات خاک میں مل گیا اور حضرت انسان کی خواہشات کے لشکر نے اس کی رہی سہی عزّت ملیا میٹ کر دی۔ ہر وقت احتیاج، کبھی کھانے کی حاجت، کبھی سونے کی، کبھی حوائجِ ضروری کی۔ بال بال اس کا محتاج ہے۔

جب اشرف المخلوقات اس قدر محتاج اور بے بس ہے تو بلاشبہ ان سب موجودات کے اوپر کوئی ایسا منتظم حاکم ضرور موجود ہے جو ان سب سے ہر وقت قیدیوں کی طرح کام لیتا ہے تاکہ کسی کو اپنے اوپر بے نیازی کا گمان نہ ہو جائے یا اپنے آپ کو تابع اور فرمان دیکھ کر خود کے اور دوسری اشیاء کے خالق کو پہچانیں اور سمجھ لیں۔ یہ اسی ذات کی خوبی اور تعریف ہے جو طرح طرح سے ان سب سے کام لیتا ہے اور ان پر قسم قسم کے احوال بھیجتا ہے اور یہ ساری موجودات اسی کی قدرت کے تحت مقہور اور تابع ہیں۔ یکسر و یک دم اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ چاند کی مجال نہیں کہ آفتاب کو پکڑے اور رات کو طاقت نہیں کہ دن سے پہلے آجائے۔ اگر یہ ستارے، چاند، سورج کسی انسان کے تحت کر دیئے جاتے تو آفتاب آٹھ بجے تک انتظار ہی میں کھڑا رہتا، دنیا کا تمام کاروبار ہی درہم برہم ہو جاتا کیونکہ افسرِ آفتاب اُٹھ کر حکم دیں کہ نکلو۔ تب کہیں آفتاب نکلے۔ ورنہ آفتاب کا جواب تو یہی ہوگا۔ " ابھی سرکار آرام کر رہے

ہیں۔ان کی ہر کروٹ پر سمجھتا ہوں کہ اب نکلنے کا حکم دیں گے۔" چرند، پرند سب اُٹھ چکے ہیں مگر فلم کے شیدائی خواب غفلت میں ہیں اسی طرح اگر انسان کے قبضۂ قدرت میں ہوا ہوتی تو لڑائی جھگڑا ہوتے ہی مدّ مقابل کی ہوا بند کر دیتے اور حکم دیتے کہ سب کے پاس جانا مگر فلاں فلاں کے پاس ہرگز نہ جائیو۔ روزی کا معاملہ انسان کے اختیار میں ہوتا تو تمام مخالف بھوکے مر جاتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص دوست ہو یا دشمن، امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا غلام سبھی ہوا میں سانس لیتے ہیں، پانی پیتے اور روزی کھاتے ہیں۔ انسان تو یہی چاہتا ہے کہ دشمن کو روزی نہ ملے لیکن ملتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ چیزیں انسان کے بس میں نہیں لہٰذا کسی با اختیار حاکم کو ضرور ماننا پڑے گا کہ وہ موجود ہے۔ جو سب کا حاکم ہے۔ اسی کا حکم چاند سورج پر چلتا ہے۔ اسی کا حکم ہوا اور پانی مانتے ہیں۔ وہی روزی رساں ہے۔ نہ اُسے نیند آتی ہے نہ اونگھ آتی ہے۔ اگر اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی نیند آجائے یا ایک لمحہ کے لئے ہم سے غافل ہو جائے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ چنانچہ وہ تمام انسانی کمزوریوں سے پاک اور مبرّا ہے۔ بس یہی بات یقینی ہے اور اس قابل ہے کہ اُسے مانا جائے۔"

مسٹر اے۔ قدیر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "تم نے مجھے چائے پینے کے لئے بلایا تھا یا ایسی باتیں کرنے کے لئے کہ میرے سر میں درد ہو جائے۔" اُنھوں نے کلیم سے شکایت کی۔

"چائے آنے ہی والی ہے۔" کلیم نے کہا: "تھوڑی سی دیر اس لئے ہو گئی کہ میں نے چائے کے ساتھ کچھ چیزیں بھی تیار کرنے کو کہہ دیا تھا۔"

"آج تو میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" مسٹر اے۔ قدیر نے ہم لوگوں کی طرف اپنا اُترا ہوا چہرہ گھما کر کہا: "کل اسی وقت آپ سب یہیں تشریف لاکر اسی مسئلہ پر گفتگو کریں اور دیکھیں کہ میں کس خوبی کے ساتھ آپ کو لاجواب کرتا ہوں"۔

شمیم اختر آہستہ سے بولے: "عبدالقدیر کیسا اچھا نام ہے۔ آپ کو تو قدیر اور قدرت والے کو مان ہی لینا چاہیئے تھا۔ بُرا ہو اس نئی تہذیب کا جس نے اتنے اچھے نام کو بگاڑ دیا۔ بھلا اے۔ قدیر کر لینے سے نام میں کونسا حُسن اور کونسی خوبصورتی پیدا ہوگئی"۔

مسٹر اے۔ قدیر مسکرا دیئے: "آپ لوگ کنوئیں کے مینڈک ہیں آپ نہیں جانتے کہ تہذیب و ترقی کے کیا تقاضے ہوتے ہیں؟"

ہمارا دل چاہا کہ ان سے پوچھیں، اگر کسی کی تہذیب و ترقی یہ کہے کہ آپ ننگے ہو کر گھومنے لگیں تو کیا آپ عمل کریں گے، مگر اسی وقت گرم گرم چائے مع لوازمات کے آگئی اور ہم سب لوگ اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔

باب ۸

اگلے روز اسی بحث کے ذوق و شوق کے پیرہن نے دامن پھیلایا۔ جذبات نے پرواز کی، احساسات نے ہاتھ تھامے اور یکے بعد دیگرے ہم سب میاں کلیم کے ہاں ایک بار پھر اکٹھا ہوئے مسٹر اے۔ قدیر بھی آئے مگر کل کی طرح ان کی نظروں میں ہمارے لئے حقارت نہیں تھی البتہ اکڑ فوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ چہرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اچھی طرح ہم سے مقابلے کی تیاری کر کے آئے ہیں۔ میاں کلیم نے بحث شروع ہونے سے پہلے چائے پیش کی

شمیم اختر نے بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا ؒ ہاں، اے قدیر صاحب۔آپ کسی نتیجے پر پہنچے ؟"

وہ چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں تک لے گئے تھے اور گھونٹ لینا ہی چاہتے تھے کہ شمیم اختر نے ان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چائے کا گھونٹ لئے بغیر انھوں نے پیالی رکھ دی اور کرخت لہجے میں بولے :"جی ہاں، خوب غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا خیال بالکل درست ہے، "دنیا کا نظام اور سارے قواعد و ضوابط مادّے اور اسکی قوّت کی کارگزاریاں ہیں

مادّہ کو اگرچہ اپنی اہمیّت اور صلاحیّت کا پتہ نہیں مگر خود بخود، بغیر سوچے سمجھے اُس سے ایسے حیرت انگیز قوانین و اصول عمل میں آتے ہیں جن کی ہماری دنیا کو نہ صرف ضرورت ہے بلکہ نظامِ دُنیا کا بھی انھیں پر دار و مدار ہے"۔

سلیم کا منہ کیک سے بھرا ہوا تھا، حلق سے آواز نکال کر کہنے لگے "ایک بات میری بھی سُن لیجئے"۔ پھر چائے کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لے کر انھوں نے منہ کے کیک کو حلق کے نیچے اُتارا اور کہا۔ "ہندوستان کے کسی گاؤں میں بچّہ پیدا ہوا، کمال کی بات یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اُس نے نہایت فصیح و بلیغ تقریر شروع کر دی۔ ایسے ایسے علوم و معارف اسکی زبان سے ادا ہوئے کہ ارسطو اور افلاطون بھی ماند پڑ گئے۔ نومولود کے ذہن نے ایسے پیچیدہ مسائل کو سلجھایا کہ نیوٹن تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ ڈارون کی تھیوری سے لیکر آئن اسٹائن تک کے نظریات کو اس بچہ نے کھیرے ککڑی کی طرح اپنے دور رس ذہن کی تلوار سے کاٹ کر رکھ دیا۔ کیوں جناب، ہے نا تعجّب کی بات؟ لوگ کچھ ہی کیوں نہ کہیں مگر آپ جیسے ذہین شخص سے اُمید ہے کہ اسکو سو فیصدی تصدیق کریں گے"۔

"جی نہیں،، مسٹر اے۔ قدیر ہنس کر بولے: "میں اتنا ذہین نہیں ہوں کہ انہونی باتوں پر اعتبار کرتا پھروں"۔

"کمال ہے"۔ شمیم اختر نے بھی انھیں کی طرح ہنس کر کہا: "آپ کو تو آنکھیں بند کر کے اسبات کی تصدیق کرنی چاہیئے کیونکہ یہ بات آپ کے خیالات و نظریات سے ملتی جلتی ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ کچھ افضل ہے۔ دیکھئے نا، مادّے

اور اسکی قوّت میں تو روح بھی نہیں ہے۔ بچّے میں روح تو ہے اور المس کے منہ میں آلۂ کلام یعنی زبان بھی موجود ہے جب کہ مادّے میں نہ روح ہے نہ زبان ہے۔ نہ کان ہیں اور نہ آنکھ ـــ بھلا جب کان، آنکھ، ناک، زبان اور دماغ رکھنے والے بچّے کی گفتگو ناممکن ہے تو ایک بے حس و بے بس مادّے اور اسکی حرکت میں یہ قوّت کہاں سے آئی کہ دنیا کے اصول و ضوابط مقرر کرکے اعلیٰ ترین قوانین بھی بنا دے۔

ع ببیں عقل و دانش بباید گریست

عقل سے کام لے کر سوچیئے کہ مادّے اور اسکی قوّت کی سحر کاریاں اس بچّے کے واقعہ سے کچھ حیرت افزا اور انہونی ہیں یا نہیں؟ بچّہ محض نامکمل انسان ہونے کی وجہ سے ان امور پر قدرت نہیں رکھتا جن کو کچھ دوسرے تعلیم یافتہ لوگ انجام دے سکتے ہیں۔ اور ایک جماد بیتھر لا یعقل جس کو ذرّہ برابر بھی ادراک و شعور نہیں ہے، پوری کائنات اور اس کی ساری مخلوقات کی حفاظت اور زینت کے لئے ایسا اعلیٰ دستور العمل تیار کر دے جس کو دیکھ کر عقلاء و فضلاء حیران و ششدر رہ جائیں اور جس کے اسرار و حکم کی گہرائیوں کو سارے انسان مل کر بھی آج تک معلوم نہ کر سکیں۔ بچّے کے بارے میں صاف انکار لیکن مادّے کے بارے میں اتنا وثوق اور یقین کہ کچھ ہی ہو، تمام قوانین کی وضع خود بخود مادّے سے عمل میں آگئی ہے اور مادّے کو اپنے اس عمل میں کوئی اختیار نہیں ہے"۔

"علامہ حسین آفندی کہتے ہیں"، سلیم نے ایک کتاب کھول کر پڑھتے

ہوئے کہا: ـــــ "ہماری اور دہریوں کی مثال ٹھیک ان تین شخصوں کی سی ہوگی جو کسی نہایت رفیع الشان اور عظیم الشان عمارت میں داخل ہوں۔ وہ عمارت متعدد کمروں اور نشست گاہوں پر مشتمل ہو۔ قیمتی دروازوں اور جنگلوں سے اُسے آراستہ کیا گیا ہو۔ برآمدے اور ڈیوڑھیاں خوب استحکام کے ساتھ بنائی گئی ہوں۔ کمروں میں اعلیٰ درجے کے فرش بچھے ہوں۔ بڑے بڑے بلند تخت لگے ہوں۔ نہایت بیش قیمت برتن اس کے چاروں طرف نہایت قرینے اور ترتیب سے رکھے ہوں۔ مختلف گھڑیوں اور متعدد مقیاس الحرا اور مقیاس الہوا سے اسکی دیواروں کی زینت کی گئی ہو۔ غرض بود و باش کے سارے ہی سامان وہاں موجود ہوں، عمارت کے چاروں طرف نہایت خوبصورت باغات ہوں اور ارد گرد ایسی چمن بندی کی گئی ہو کہ درختوں کی صفیں دیکھتے ہی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہوں۔ پھولوں کی کیاریاں موقع موقع سے بنائی گئی ہوں۔ نہروں میں صاف و شفاف پانی بھرا ہوا شوخی کر رہا ہو۔ خلاصہ یہ کہ عیش و آرام کے ایسے سامان ہوں کہ دیکھنے والا یہی کہے کہ اس چیز سے فلاں فائدہ ہے اور اس چیز سے فلاں ضرورت پوری ہوتی ہے۔ یقیناً اس عمارت کا بنانے والا بڑا عقلمند اور خوش تدبیر ہے۔ اسکی جو چیز بنائی ہے قرینے اور حکمت سے بنائی ہے۔ جس چیز کے لئے جو مقام تجویز کیا گیا، وہی اس کے لئے مناسب تھا۔

اس مقام پر پہنچ کر اُن دونوں میں سے ایک کہہ اُٹھا: "کوئی شک نہیں کہ بنانے والا ساری عجیب و غریب صناعیوں پر قادر ہے، اور تالیف و تہذیب اور تعمیر کے قاعدوں سے بڑی واقفیت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُس نے انتہا درجہ

کی حکمت و ذہانت کے موافق اس کو اتنا مضبوط و استوار بنایا ہے اور اس خوبی سے سارے لوازمات کامل طور پر مہیّا کر دیئے گئے کہ یہاں رہنا اور کماحقہٗ، عیش و آرام سے بسر کرنا ممکن ہو اور کوئی امر آسائش و راحت میں مخل نہ ہونے پائے اگرچہ بنانے والے کو ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس میں علم و قدرت، تدبیر و حکمت جیسے اوصاف جن کی اچھی عمارتیں تعمیر کرنے میں ضرورت پڑتی ہے، سب بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ چنانچہ اس عمارت میں بعض چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کی حکمت و ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ بنانے والے کے نزدیک اس میں بھی حکمت اور مصلحت ہوگی"۔

دوسرا بولا: "نہیں یار۔ اس عمارت کی تعمیر و وجود کا جو سبب تم نے بتایا ہے، وہ تمھاری خوش فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پہاڑی اور اس کے دامن میں بہنے والا وہ چشمہ"، اُس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں پر ہمیشہ سے موجود ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے پہاڑی کی مٹی اور پتھروں کو ادھر اُڑا کر لاتے رہے ساری چیزیں مختلف شکلوں اور ڈھیروں میں یہاں جمع ہوتی رہیں اور بارش کا پانی ان میں تصرّف کرتا رہا۔ کبھی شکل کچھ ہوگئی، کبھی کچھ۔ ہوا اور پانی کے اس مسلسل عمل کے باعث ہزاروں لاکھوں برس گزرنے کے بعد ان چیزوں نے باقاعدہ اس عمارت کی شکل اختیار کر لی جس میں کمرے، نشستگاہیں، دروازے جنگلے، برآمدے، راستے، حوضیں، نہریں، سبھی بن گئے۔ نہروں کے جاری ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ پہاڑی کے دامن والے چشمے سے پانی بہہ بہہ کر محل کے صحن میں مختلف طریقوں سے جاری ہوا۔ اس پانی سے مٹی گلتی رہی۔ ہوا

اور پانی اس راستے پر اثر انداز ہوتے رہے۔ شدشدہ ہزاروں لاکھوں برسوں میں باقاعدہ نہریں جاری ہوگئیں اور حوضیں بن گئیں۔ اور موجودہ انتظام کے ساتھ پانی بھی بہنے لگا۔ رہے یہاں کے برتن، گھڑیاں اور فرش و فروش وہ اس طرح اکٹھے ہوئے کہ مسافروں کے قافلے ادھر سے گزرتے اور یہاں ٹھہرتے ہوں گے۔ ان کی یہ چیزیں اتفاق سے یہاں رہ گئیں اور ہوا ان کو اپنے جھونکوں سے ادھر اُدھر منتقل کرتی رہی حتیٰ کہ سالہا سال کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ فرش باقاعدہ بچھ گئے۔ برتن قطار در قطار آراستہ ہوگئے۔ گھڑیاں اور مفیاس دیواروں پر آویزاں ہوگئیں۔ یہی بات یہاں کے درختوں اور پودوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ہوا اُن کے بیجوں کو ادھر اُڑا لے آئی۔ نہر کے پانی سے اُن کی آبپاشی ہوئی۔ یہاں تک کہ بیج اس زمین پر جم گئے اور ہوا سے ادھر ادھر منتقل ہوتے ہوتے موجودہ شکل میں آگئے ــ بس یہ ہے اس عمارت کی کہانی میری عقل تو یہی کہتی ہے۔"

تیسرا بولا: "پہلے دوست کو خوش فہمی ہے تو آپ غلط فہمی کا شکار ہیں حقیقت یہ ہے کہ پہاڑی کے پتھر خود بخود اُکھڑے اور یہاں آگئے۔ خود بخود پانی آیا اور خود بخود گارا بننا شروع ہوگیا۔ اینٹیں تھپ کر سوکھیں اور قطار در قطار کھڑی ہوگئیں۔ اور اس طرح بغیر کسی معمار اور مزدور کے خود بخود یہ عمارت اتنی عمدہ بن گئی کہ عقل والے حیران ہیں ـــ خلاصہ میری گزارش کا یہ ہے کہ تمام کارروائی خود بخود عمل میں آئی ہے۔ نہ کوئی معمار ہے نہ مزدور، نہ انجینئر ہے اور نہ نقشہ نویس نہ بنانے والا نہ اُگانے والا، نہ ترتیب دینے والا اور

نہ دیکھ بھال رکھنے والا۔ سب کچھ اپنے آپ بنا اور بننے بنانے کا عمل ہنوز جاری ہے۔ اس لئے ہر چیز بنے جاری ہے اور یونہی آپ ہی آپ بنتی چلی جائے گی۔ میرا تو بس یہ ہی عقیدہ ہے۔"

جس شخص کے دماغ میں ذرا بھی عقل اور انصاف ہو، بے لاگ ہو کر تینوں دوستوں کے بیانات کا فیصلہ کر دے گا اور بے تعصّب ہو کر بتلائے کہ کوٹھی کی تعمیر کا وہ سبب جو پہلے دوست نے بتایا ہے، عقل کے نزدیک ماننے کے قابل ہے یا دوسرے اور تیسرے دوست کے ارتقائی نظریات۔ اور اسی طرح اس کائنات کی تعمیر و ترتیب کے واسطے ایک قادر مطلق اور علّام الغیوب حکیم و علیم خدا کا اعتقاد رکھنا زیادہ قرینِ قیاس ہے یا یہ سمجھنا کہ کائنات کا وجود جاہل و اپاہج مادّہ کا محتاج ہے یا یہ کہنا کہ سب کچھ خود بخود ہو گیا، زیادہ موزوں ہے؟

مسٹر اے۔ قدیر ہم لوگوں کو قائل و معقول کرنے کے لئے گھر سے نجانے کیا کیا سوچ کر آئے تھے لیکن سلیم نے اقتباس پڑھ کر سنایا تو گنگ ہو کر رہ گئے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ چائے کے گھونٹ "تلخ" معلوم ہونے لگے۔

"میاں کلیم بولے": بلاشبہ ہمارے زمانے کے کچھ انسانوں سے سخت غلطی ہوئی ہے کہ اُنھوں نے ایسے اعلیٰ درجے کے قوانین قدرت کو جن سے خدائے تعالیٰ کی حکمتوں اور صناعیوں کی بوقلمونی ظاہر ہوتی ہے۔ خدا کی امداد کا محتاج نہیں سمجھا بلکہ قوانینِ قدرت کی حرکت یا قوّتِ مادّہ کے باہمی تناسب اور اتحاد و ربط کو دیکھ کر خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ برین عقل و دانش بباید گریست۔"

شمیم اختر نے کہا: "مسلمان جو کچھ کہتے ہیں عقل و فہم کے عین مطابق ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے سوا سب اشیاء فانی ہیں اور سب چیزوں کا وجود خدا تعالیٰ کے وجود کے سامنے بالکل اسی طرح عارضی اور مستعار ہے جیسا کہ دھوپ کا نور، نورِ آفتاب کے سامنے اور گرم پانی کی حرارت، آگ کے سامنے، اور اس خدائے وحدہٗ لاشریک نے اپنی قدرتِ کاملہ اور ارادۂ نافذہ سے ہر چیز کو نیست سے ہست کیا اور اپنے اختیار سے جب چاہے گا، نیست کر دے گا۔ نہ اسکو مادّہ کی احتیاج ہے اور نہ اس پر روح کی حکومت ہے، نہ اس کے خیالات محدود ہیں اور نہ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی ہے۔ وہ تمام کمالات کے ساتھ موصوف ہے اور جملہ نقصانات ——— وعیوب سے پاک ہے کیونکہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں اور وجود ہی ان کا سرچشمہ ہے۔ تمام نقصانات عدمی ہیں اس لئے عدم ہی ان کا باعث ہوا۔ چنانچہ واجب الوجود میں تمام کمالات ہی کمالات ہوئے اس کا وجود خود خانہ زاد ہے۔ کسی دوسرے سے آیا ہوا نہیں۔ لہٰذا مخلوقات میں جتنے کمالات اور محاسن ہوں گے وہ سب اسی کے کمالات و محاسن کا پرتو ہوں گے"۔

سلیم نے مثبت انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا: "جب ایسی ذات ستودہ صفات نے اپنے اختیار و قدرت سے دُنیا کو بنایا ہے تو یقیناً اسکی ایجاد و بقاء میں بے انتہا حکمتیں ہوں گی اور بلاشبہ بنانے سے پہلے ہی خدا تعالیٰ کے علم اس کا نقشہ اور ہر ہر چیز کا پیمانہ ابتداء سے لے کر انتہا تک موجود ہے۔ جس کو ہم اہلِ اسلام تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں، اور لغت میں تقدیر کے معنی

اندازہ کرنے ہی کے ہیں ۔ گویا تقدیر اللہ تعالیٰ کا اندازہ ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس لیے اس کے اندازے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔"

میاں کلیم بولے: "کچھ آپ بھی تو ارشاد فرمائیے۔ مسٹر اے۔ قدیر؟"

"کہنا تو بہت کچھ ہے۔" مسٹر اے۔ قدیر نے کہا: "مگر کل کی طرح آج پھر اچانک میرے سر میں درد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اگر تمھارے پاس اسپرین کی گولی ہو تو لا دو، اور اس گفتگو کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دو۔"

◎

باب ۹

کالج کھلے نہ کھلے، چھٹی تو رہتی ہی ہے۔ جب چاہو چھٹی منالو اور جب چاہو پڑھنے پر بیٹھ جاؤ وجہ یہ ہے کہ پہلے پرنسپل و اساتذہ کا ادب و احترام کیا جاتا تھا اب نہ ادب و احترام کرایا جاتا ہے پرنسپل صاحب ہوں یا دیگر اساتذۂ کرام انکی حیثیت سرکاری ملازم بلکہ طلبہ کے ملازمین سے زیادہ نہیں ظاہر ہے کہ ملازمین کو اپنے آقاؤں کا تابع فرمان ہو کر ہی رہنا پڑے گا۔

میٹنگ ہوئی۔ آج تعلیم نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ گرمی کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ہوا بھی بند ہے۔ تھرڈ ایئر والے بینچیں بجا بجا کر نعرے لگا رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آج ان لوگوں کا بھی پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔ ہم نے سوچا کہ کلاس میں بیٹھ کر شور مچانے سے تو زیادہ اچھا ہے کہ شمیم اختر کے پاس چلے جائیں۔ وہ حسب معمول کالج کے پارک میں لیٹے ہوں گے۔

پارک میں پہنچے تو دیکھا کہ شمیم اختر اکیلے نہیں بلکہ ان کے پاس کلیم اور سلیم بھی بیٹھے ہوئے تھے، کالج اور مغربی تعلیم سے پیدا شدہ

برائیوں کا بیان ہو رہا تھا سلیم کو شکوہ تھا کہ نہ استاد قابل رہے اور نہ طلبہ ہی محنت کرتے ہیں"۔ میاں کلیم کہہ رہے تھے "طلبہ محنت بھی کریں تو کیا ہوتا ہے۔ سفارش اور اقربا پروری نے محنتی طلبہ کی کمر توڑ رکھی ہے"۔ شمیم اختر کا دعویٰ تھا کہ "استاد تو آج بھی قابل ہیں مگر جب سے طلبہ کو مغربی طرز پر مرکزِ تعلیم قرار دیا گیا ہے، اساتذہ کی عزّت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ جب طلبہ اپنے آپ کو اساتذہ کے مقابلہ میں زیادہ باعزّت اور باوقعت سمجھنے لگیں تو افادہ و استفادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

تھوڑی دیر تک ہم تینوں کی بحث سنتے رہے۔ آخر میں جب یہ دیکھا کہ بحث بڑھتے بڑھتے ذاتیات تک جا پہنچی ہے تو بہتر یہی سمجھا کہ موضوع گفتگو بدل دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے کہا:

شمیم صاحب! کیا مسلمان ہمیشہ سے علوم و فنون میں دیگر اقوام سے آجکل کے مسلمانوں کی طرح پیچھے تھے یا ہم نے غلامی کی زندگانی کو اپنے مذہب سے روگردانی کر کے اختیار کیا اور اپنا اصل سرمایہ دوسری اقوام کو فروخت کر دیا۔ مغرب نے یہ علوم و فنون کس جگہ سے حاصل کئے ہیں۔ آخر انھوں نے بھی کسی سے چرائے ہیں ورنہ ان کی تاریخ شاہد ہے کہ چند صدیوں قبل تک یہ قومیں پستی کے گہرے غار میں پڑی تھیں۔ کہیں وہ ہمارے ہی گھر کا خزانہ تو نہیں جسے آج ہم حیرت سے دیکھتے اور ان کی تعریف میں ہر وقت رطب اللسان رہتے ہیں۔ ذرا یہ تو بتایئے کہ ہم کون تھے اور کہاں پہنچ گئے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم دیگر اقوام کے نظریاتِ باطل کے دلدادہ ہو چکے ہیں اور ہم میں سے بہت

سے مسلمانوں نے فرائض و واجبات تک کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ لباس و فیشن اور تہذیب و تمدّن تو بدلا ہی تھا، مگر اب تو اعتقادات تک کی خیر نہیں۔ ظالموں نے ہماری بنیادیں چُرائیں اور ان پر اپنی عمارت کھڑی کر کے کہا کہ یہ ہماری بنیادی عمارت ہے۔ ہمارے اصول اپنائے اور کہا کہ یہ ہمارے اصول ہیں۔ ہم بھی کچھ ایسے اندھے ہوئے اور ہماری عقلوں پر کچھ اس طرح پتھر پڑے کہ سوچے سمجھے بغیر ہم نے لبیک کہا۔ انھوں نے قید لگادی کہ ہماری عمارت میں وہی آسکتا ہے جو اپنے مذہب سے دشمنی کرے۔ ہمارے اصول وہی اپنا سکتا ہے۔ جو مذہبی عقائد کو بدلے اُنھوں نے اپنی عمارت کو اوپر اوپر سے سجایا۔ عیش و عشرت کی چاشنی ملائی۔ دعوای یہ کیا کہ اس عمارت میں آنے والا ہر قسم کے مصائب و آلام سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ہم مصیبتوں اور پریشانیوں کے مارے ہوئے یہ نہ سمجھے کہ یہ کیا دھوکا ہے۔ ظاہری زینت اور ٹیپ ٹاپ اور آوارگی و عیاشی سے مرعوب ہو گئے۔ کتنے ہی مسلمان ایسے تھے جو انگاروں کو پھول سمجھ کر اُن کے ہو گئے اور اپنوں کو چھوڑ گئے۔ آرام و سکون تو انھیں پھر بھی میّسر نہ ہوا۔ رہی سہی عزّت بھی خاک میں مل گئی۔ غیروں کا سلوک ان کے ساتھ ایسا ہوا کہ چوہڑے چمار سے بھی بدتر سمجھا گیا۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ ہم تو آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم کیا تھے؟ ہمارے آباؤ اجداد کا علم اور تمدّن و تہذیب کسی عروج پر تھا؟"

شمیم اختر کے ہونٹوں پر جب گہری مسکراہٹ پھیل جائے اور بڑی بڑی آنکھیں چمکنے لگیں تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ کوئی بہت اہم بات بتانا چاہتے

ہیں۔ اس وقت بھی جب ہم نے یہ سوال کیا، ان کے ہونٹ مسکرا اُٹھے اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ کتابوں کا تکیہ بنائے ہوئے وہ پارک کے سبزے پر نیم دراز تھے۔ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے: "شکر ہے میں نے آج ہی کالج کی لائبریری سے انسائیکلو پیڈیا کی پہلی جلد نکلوائی ہے۔ اور اتفاق سے وہ جلد اس وقت یہیں موجود ہے۔ چنانچہ آپ کے سوال کے جواب میں صرف یہ کہوں گا کہ جو علوم وفنون دنیا میں مسلمانوں کے ذریعے پھیلے اور جن شعبوں کی ترقی مسلمانوں کے باعث ہوئی اس کا ذکر اس انسائیکلو پیڈیا میں موجود ہے۔ اس کتاب کی مدد سے غیروں کی زبانی مسلمانوں کا حال سنیئے۔ تاکہ جو لوگ مسلمانوں کو علم و تمدّن اور اختراعات و ایجادات کا دشمن بتاتے اور اسی مفروضہ دشمنی کو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں، وہ اپنی کم علمی اور کوتاہ فہمی پر کچھ شرمائیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے خوبصورت سی سنہری جلد کی ایک موٹی سی کتاب انگریزی کی اُٹھائی جسے لندن کے کسی پبلشر نے چھاپا تھا۔ پھر مسلمانوں کے علوم وفنون کی ترقی سے متعلق باب نکال کر اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں سنانا شروع کیا:

"۷۴۹ء خلفائے عباسیہ کے دور میں علم و ادب اور فنون و حکمت یعنی سائنس کا ظہور ہوا اور منصور عباسی کے دور ۷۵۴ء سے لیکر مامون رشید کے دور ۷۸۶ء تک بڑی فیاضی سے اس کی سرپرستی ہوئی اور خلفائے نے بڑی سخاوت کے ساتھ علماء، فضلاء اور محققین پر داد و دہش کی، یونان، شام، ایران کی عمدہ عمدہ قدیم کتابوں کو عربی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا۔ خلیفہ مامون

رشید نے شاہ روم کو ساڑھے بارہ من سونا صرف اس لئے دیا کہ اس کے دربار کا ایک فلسفی کچھ عرصے کے لئے مامون کے دربار میں آکر فلسفہ و حکمت کی تعلیم دے۔ حصول تعلیم کے لئے اس قدر زرِ کثیر خرچ کرنے کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ مامون ہی کے زمانے میں بغداد۔ بصرہ، بخارا اور کوفہ میں بڑے بڑے مدرسوں کی بنیاد پڑی۔ اسپین میں مسلمانوں کا قائم کیا ہوا قرطبہ کا مدرسۂ اعظم بغداد کے مدرسے کی طرز پر قائم کیا گیا تھا۔ پوری دسویں صدی عیسوی میں دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر اور مفکّرین عموماً مسلمان ہی نظر آتے ہیں۔ فرانس، انگلینڈ روس، آئرلینڈ، جرمنی اور دیگر مغربی ممالک کے طلبہ جوق در جوق حصولِ علم کے لئے اندلس کے مسلمانوں کے مدرسوں میں آیا کرتے تھے۔ انھوں نے ریاضی، طب اور جغرافیہ کی تعلیم عربوں سے حاصل کی۔ صرف اندلس میں مسلمانوں کے چودہ مدرسے اور تقریباً اتنے ہی بڑے بڑے کتب خانے تھے اور صرف حاکم کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ اگر اس علمی وجاہت کا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے قبل عرب کی حالت کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان فتوحات میں سبقت کرنے کی طرح علوم و فنون میں بھی بڑی سبقت کرنے والے تھے۔ جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، طب، طبیعات، ریاضی اور فلکیات میں مسلمانوں نے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور آج تک عربی الفاظ و محاورات ان علوم میں مستعمل ہیں۔ بہت سے ستاروں کی دریافت بھی عربوں کی مرہونِ منّت ہے اور ان کے نام بھی عربوں ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ جغرافیہ، پرانی عربی، مفروسیات کے رسالوں اور ابو البقاء کی تصانیف میں ملتا ہے۔ ابنِ بطوطہ، ابن فصلان اور

بیرونی وغیرہ کی تحریریں علم تاریخ وسیاحت کی شاہد ہیں۔ سب سے قدیم مؤرخ محمد الکلبی کو کہا جاتا ہے جس کی وفات ۸۱۹ء میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد دسویں صدی عیسوی میں تو تاریخ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اوّلین مؤرخوں کی فہرست میں مسعودی، طبری، حمزہ، اصفہانی اور بطریق اسکندر ہیں۔ عرب کے فلسفہ یعنی یونان سے اخذ کردہ قدیم سائنس اور ارسطا طالیس کی تصانیف کے عربی ترجمے کیے گئے اور انگریز ان ترجموں کو اپنے ملک میں لے گئے۔ قدیم سائنس کے مبصر آلکندی البصری نویں صدی عیسوی میں ہوئے۔ الفارابی نے ۹۵۴ء میں اصول پر ایک کتاب لکھی۔ ابن سینا نے منطق، طب اور علم مابعد الطبیعات کو جمع کیا اور علم کیمیا علم تشخیص الامراض اور شناخت ادویہ میں ترقی کی۔ ابن یحییٰ کی تحقیقات بہت مشہور ہوئیں۔ الغزالی نے فلسفہ پر کتابیں لکھیں۔ ابوبکر بن طفیل نے اپنی تصنیف "ابن یقظان" میں انسانوں کا حیوانوں سے ظہور میں آنے کا مسئلہ پر ارتقائی منازل کے بارے میں اپنے خدشے کا اظہار کیا جس کو ڈارون نے اپنا عقیدہ بنا لیا یہی مسئلہ بعد میں ڈارون کی تھیوری کہلایا۔ عرب کے فیلسوف اکثر طبیب بھی تھے۔ انھوں نے دواؤں کے خواص واثرات میں مہارت حاصل کی اور کتابیں لکھیں علم طب یعنی ڈاکٹری تو دراصل عرب ہی کی ایجاد ہے۔ دواؤں کے مرکبات بنانے اور نسخہ لکھنے کے طریقہ سے انھوں نے ہی روشناس کرایا ورنہ پہلے کے طبیب دوائی کا نام بتانا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ علم یورپ میں پھیلا۔ اس طرح دواسازی کے میدان میں قرابادین نامی کتاب

کی مدد سے تین سو سال تک مسلمانوں نے بغداد، اصفہان، فیروز آباد، بلخ کوفہ، بصرہ، اسکندریہ اور قرطبہ میں بڑے بڑے مدرسے قائم کر کے دواسازی سکھائی اور طبیعات و ڈاکٹری کے ہر شعبے میں بڑی ترقی حاصل کی اور خوب نام پیدا کیا۔ ابن سینا اور ہارون کندی کے درس مدّت تک جاری رہے۔ ابن سینا نے "قانون" نامی ایک کتاب بھی تحریر کی جسے آج تک قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ علی بن عباس اسحٰق ابن سلیمان۔ ابوالقاسم اور علی بن عیسٰی نے طب کی تکمیل کی۔ ریاضی میں الجبرا علی بن عیسٰی اور ابن خیام کی ایجاد ہے۔ بغداد اور کوفہ کی رصد گاہوں میں علمِ ہیئت کا زور تھا۔ نصیر الدین طوسی نے اقلیدس کا ترجمہ کیا۔ نظام بطلیموس کی کتاب "موتی"، کو الہادی اور سیومیوس نے عربی میں ترجمہ کیا۔ دسویں صدی عیسوی میں البائن نے زمین کے ارتقاع پر نظر کی اور محمد بن الجبر ثانی نے آفتاب کی رفتار دریافت کی۔ الفر جیوش نے ستاروں پر کتاب لکھی"۔

شمیم اختر نے انسائیکلو پیڈیا بند کر کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا:

"یہ مسلمانوں کے وہ واقعات و حالات ہیں جن کو غیروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ان کے علاوہ تہذیب و تمدّن، اخلاق و حکمت، سیاست و حکومت ملک کے تمام قوانین پر مسلمانوں کی مدوّن کردہ کتب موجود ہیں۔ غرض یہ کہ مسلمانوں نے جو مذہب کے دلدادہ و عاشق تھے، خدا پر یقین کامل رکھتے ہوئے ایسی ایسی ایجادات کیں جو عقل انسانی کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ لیکن

بعد میں غیروں کے زیر اثر آکر مسلمانوں نے اپنے آباؤ واجداد کے کارناموں اور ایجادوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔ دوسری اقوام نے خاموشی کے ساتھ انھیں اپنا کر فائدہ اٹھایا اور اپنا نام پیدا کیا۔ مسلمانوں کے قدیم فلسفے کو نئے طرز سے سائنس کے نام سے پیش کیا، اور مسلمانوں کے ہی اصولوں مشاہدوں اور تجربوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے علم وعمل کے میدان میں قدم اُٹھائے اور یہ ظاہر کیا کہ سب کچھ انھیں کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔"

سلیم بولے: "اگر انسائیکلوپیڈیا کی شہادت نہ ہوتی تو شمیم صاحب ہم آپ کی ساری باتوں کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیّت نہ دیتے۔ کمال ہے کہ ساری ایجادات مسلمانوں ہی کی مرہونِ منّت ہیں۔ ہمارے ہی کارنامے اور ہماری ہی نظروں سے اوجھل کر دیئے گئے اور ہم اہلِ اسلام اپنی کم علمی کے باعث غیروں کی شادی کے ڈھول بجا رہے ہیں اور اپنا قیمتی سرمایہ گنوا دینے کے باوجود اس پر افسوس وتاسّف کا ایک آنسو تک نہیں بہاتے۔ ہم اپنے اسلاف کے قدم بقدم چلنا شروع کر دیں تو نہ مذہب سے بیگانگی رہے نہ خدا سے بیزاری ہو اور دنیا کے صفِ اوّل کے علماء اور حکماء میں ہمارا شمار کیا جائے۔"

شمیم اختر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری: "افسوس تو یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا، وہیں اُٹھا بیٹھا۔ ایک ذرا سے کالج کے چکّر میں آکر کس طرح اپنے معبودِ حقیقی کے وجود میں شک کرنے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک اہلِ مغرب بڑے محقّق ہیں۔ کم از کم انھیں کی شہادت

کی طرف التفات کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ خود خدا کے وجود کے قائل ہو رہے ہیں، اور ہم ہیں کہ نام نہاد ترقی و تعلیم کے شوق میں اللہ تعالیٰ کو بھولے جا رہے ہیں۔"

ہم نے کہا: "کیا آپ ایسی شہادتیں پیش کر سکتے ہیں جن سے پتہ چلے کہ اہلِ مغرب کس طرح مصنوعات سے ان کے صانع پر استدلال کرتے ہیں؟"

شمیم اختر نے اپنی کتابوں میں رکھا ہوا ایک میگزین اٹھا لیا اور اُسے کھول کر بولے "یہ دیکھیے۔ یورپ کا ایک محقق راسین ان مناظرِ قدرت کو دیکھ کر کیا کہہ رہا ہے:

اے آسمانو! مجھ کو خبر کر دو۔ اے دریاؤ! مجھ کو بتاؤ۔ اے زمین مجھ کو جواب دے۔ اے بے انتہا ستارو! تم ہی بولو کہ کون ہاتھ ہے جس نے تم کو ہمارے سروں کے اوپر تھام رکھا ہے۔ اے چودھویں تاریخ کی چاندنی رات! کس نے تیری تاریکی کو دور کر کے تجھے اتنا حسین اور خوشنما بنایا۔ تیرا حُسن و جمال بتا رہا ہے کہ تیرا کوئی ایسا صانع اور بنانے والا موجود ہے۔ جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت و پریشانی کے بنایا اور تیری چھت کو قبہ ہائے نور سے روشن و مزین فرمایا۔ اسی نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے اور اس کی گرد کو اُبھارا ہے اے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج! سچ بتا تو کس کی اطاعت کے لئے پردۂ محیط سے باہر آجاتا ہے اور فیاضی کے ساتھ اپنی روشن شعاعیں دنیا پر ڈالتا ہے۔ اے پُر رعب اور پُر ہیئت سمندر! تیری موجوں کے جلال سے معلوم ہوتا ہے کہ تو غضب ناک ہو کر زمین

کو نگل جانا چاہتا ہے۔ آخر کس نے تجھ کو تھام رکھا ہے، کس نے تجھ جیسے شیر کو کٹہرے میں قید کر رکھا ہے کہ تیری موجوں کا زور ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

اور ملین ایڈ ورڈ کہتا ہے: "انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاھدات کے ہوتے ہوئے ایسے بے وقوف لوگ بھی موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ تمام عجائبات صرف بخت واتفاق کے نتائج ہیں۔ یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں جن کو لوگوں نے علم محسوسات کا لقب دیا ہے۔ حقیقی علم کے نزدیک یہ خیالات بالکل باطل ہیں فزیکل سائنس دان کبھی ان پر اعتقاد نہیں رکھ سکتا"۔

ہر برٹ اسپنسر کہتا ہے: "یہ اسرار جو روز بروز زیادہ سے زیادہ دقیق ہوتے جا رہے ہیں جب ان پر بحث کی جائے تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی ابدی قوت ہے جو تمام اشیاء کے وجود کی خالق ہے"۔

پروفیسر لینا کہتا ہے: "وہ خدائے اکبر جو ازلی ہے، تمام چیزوں کا جاننے والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے، اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتا ہوں"۔

ہم نے شمیم اختر کے ہاتھ سے میگزین لے کر ایک نظر اس پر ڈالی اور تعریفی انداز سے کہا: "ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مغرب مادہ پرستی

چھوڑ کر ہماری طرف آنے جا رہے ہیں اور ہم اندھی تقلید کے جوش میں ان کے ترک کئے ہوئے توہّمات کو اپنے سینے سے لگا رہے ہیں خدا کو نہ مان کر اٹکل پچّو، تخمینی اور ظنّی توہّمات ہی کی پرستش کرنا ہے. اللہ ہمیں اپنی حفاظت میں رکھّے ۔ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ انشاءاللہ پھر ملاقات ہو گی"۔

ان لوگوں سے ہاتھ ملا کر پارک کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا اور وہ لوگ دوبارہ کالج کی سیاست پر بحث کرنے لگے ۔

◎

باب ۱۰

اگلے روز شمیم اختر کی رائے ہوئی کہ میاں کلیم کے ہاں چلنا چاہیئے۔ کئی روز سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ ہم دونوں گلیوں میں ہوتے ہوئے بازار کی نکڑ تک پہنچے، بجلی کے کھمبے سے مڑ کر گھڑی ساز کی دوکان کی پشت پر میاں کلیم کی ڈیوڑھی تھی۔ ہم نے دستک دی تو اندر سے ملازمہ نے آکر بتایا کہ کلیم صاحب غسل کر رہے ہیں، آپ لوگ بیٹھک میں تشریف رکھیں۔ ملازمہ کی رہنمائی میں ہم لوگ بیٹھک میں جاکر بیٹھ گئے۔ وہ اندر اطلاع کرنے گئی اور ہم لوگ اس ناقابلِ برداشت رجحان کے بارے میں گفتگو کرنے لگے جو سطحی طور پر سائنس گزیدہ افراد کا طرۂ امتیاز ہے کہ وہ وجود باری میں شک و شبہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کو ماننا کوئی غیر سائنٹفک بات ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے اور اسکی صفات سائنس کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہیں۔ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو سائنس اللہ تعالیٰ کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کی صفات کی نشانیاں بتاتی ہے۔ ذہین سائنسدان یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود ایک واقعی حقیقت ہے۔ اس سے وہی

انکار کر سکتا ہے جو جہالت میں گھرا ہوا ہو اور اپنی جہالت کو چھپانے اور جھوٹی علمیت کا اظہار کرنے کے لئے فرضی باتیں کرنے لگتے ہیں، جیسے پھر پھیہ میں ایک مسخرے نے ایک بات فرض کر لی تھی۔

شمیم اختر بولے: "یہ پھر پھُر والی بات سمجھ میں نہیں آئی"۔

ہم نے کہا: "ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص جب کوئی نوکر رکھتا تو شرط یہ ہوتی کہ شام کو سب کام بتانے ہوں گے۔ جب شام ہوتی تو کھانا کھا کر خود چارپائی پر لیٹ جاتا اور نوکر سے کہتا: "بتاؤ۔ کیا کیا کام کئے؟" نوکر کام بتاتا۔

وہ پوچھتا: "پھر کیا کیا؟"

نوکر بے چارہ سوچکر کچھ اور بتاتا تو وہ دوبارہ "پھر" کہتا۔ اسکو اسی پھر میں مزہ آتا تھا۔ بس پھر پھر کئے جاتا۔ آخر چند روز پھر۔ پھر کی تکرار سن کر نوکر ملازمت چھوڑ دیتا۔ ایک مسخرے نے سُن لیا تو اس نے اپنے ایک دوست سے کہا میں اسکی پھر چھڑاؤں گا۔ چنانچہ وہ اس شخص کے ہاں گیا اور کہا: "آپکے ہاں ملازمت کرنے آیا ہوں"۔

اس شخص نے کہا: "ہمارے ہاں ملازمت کی یہ شرط ہے کہ روزانہ شام کو سارے کام دُہرانے ہوں گے"۔ مسخرے نے منظور کر لیا۔ شام کو حسب معمول وہ شخص کھانا کھا کر چارپائی پر دراز ہو گیا اور مسخرے کو بلا کر پوچھا: "آج تم نے کون کون سے کام کئے ہیں؟"

مسخرے نے کہا: "صبح سے شام تک یہ یہ کام کئے"۔ تفصیل سُنکر

اُس نے کہا "پھر؟"

مسخرے کو اسی پھر سننے کا انتظار تھا۔ کہنے لگا آج میں جنگل میں گیا۔ وہاں ایک جگہ بہت سی چڑیاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ میں نے جال لگا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام دنیا کی چڑیاں اس جال میں پھنس گئیں"۔

اس شخص نے کہا: "پھر؟"

مسخرے نے کہا: "میں نے سوچا کہ اتنی چڑیوں کو کہاں رکھتا پھروں گا۔ اس لئے جال کا ایک سوراخ کاٹ دیا۔ تاکہ چڑیاں اُڑ جائیں"۔

اُس شخص نے کہا "پھر"!

مسخرے نے جواب دیا، پھر ایک چڑیا پھُر سے اُڑ گئی"۔

"پھر"

"پھر دوسری پھُر سے اُڑ گئی"۔

"پھر"

"پھُر"

جب آٹھ دس مرتبہ ہر پھر کا جواب "پھُر" ہی ملا تو وہ شخص اُٹھ کر بیٹھ گیا اور غصّہ سے آنکھیں نکال کر بولا "ختم کرو اس بکواس کو۔ یہ بتاؤ کہ جب ساری چڑیاں اُڑ گیئں پھر کیا ہوا؟"

مسخرہ بولا: "حضور جال میں تمام دنیا کی چڑیاں جمع تھیں۔ وہ اتنی آسانی سے کہاں ختم ہوں گی۔ ایک ایک کر کے اُڑ رہی تھیں۔ آپ پوچھتے رہیئے، میں چڑیوں کے اُڑنے کا واقعہ بتاتا رہوں گا۔ جب تک ساری

چڑیاں ختم نہیں ہو جائیں گی۔ اگلی بات نہیں بتاؤں گا۔"

یہ ہے پھر اور پھُر کا لطیفہ۔ بھلا دنیا بھر کی چڑیاں اور صرف ایک جال میں؟ صرف مفروضہ بات ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بس یہی حال وجودِ باری کے منکرین کا ہے۔ وہ بھی یونہی مفروضہ باتیں کرتے ہیں کہ بغیر دیکھے کسی کو کیسے مان لیا جائے؟ اب لاکھ دلیلیں دو۔ مسخرے کی پھر پھُر کی طرح وہ بھی یہی دہراتے رہتے کہ پہلے ہمیں خدا کو دکھا دو۔ کیا ہر چیز دیکھنے کے بعد ہی تسلیم کی جاتی ہے؟ ـــ رات دن بلا دیکھے ہم بہت سی چیزیں تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ گھڑی کو دیکھ کر ایک صاحبِ عقل آدمی گھڑی ساز کو دیکھے بغیر استدلال کر لیتا ہے کہ ان صفات کی یہ گھڑی ایک شخص نے بنائی ہے۔ اس استدلال کے لئے براہِ راست گھڑی ساز سے ملاقات یا اسکی کارکردگی کا عینی مشاہدہ ضروری نہیں۔ گھڑی کا وجود۔ اسکی ساخت و ترکیب، اس کا ٹھیک وقت بتانا ایک عاقل آدمی کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ وہ خود بخود نہیں بنی بلکہ ایک شخص نے ایک منصوبے کے مطابق ایک خاص مقصد کے لئے بالارادہ بنایا ہے۔ اور ایسی گھڑی بنانے والے کے اندر لازماً یہ صفت اور اہلیت ہونی چاہیئے۔"

شمیم اختر نے تصدیق کی: "جی ہاں۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے کہ منکرین خدا محض تخمینی اور فرضی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ دنیا محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے، خود بخود اتفاقی طور پر وجود میں آگئی ہے۔ کچھ کے نزدیک مادّے اور اسکی حرکت سے اس کی تخلیق ہوئی ہے، کوئی صرف

توّت کا قائل ہے، کوئی یہ کہہ کر دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتا ہے کہ مادّہ سے ایک سو دو عناصر پروٹون، نیوٹرون اور الیکٹرون کی شکل میں بن کر نکل آئے۔ اور ان سے اس پوری دنیا کی تخلیق ہو گئی۔ یہ تو ایسی مثال ہوئی کہ کسی ہنڈیا میں بہت سے پروٹون اور الیکٹرون کو پکایا جائے اور خود بخود ایک سو دو عناصر تیار ہو کر ہنڈیا سے باہر نکل آئیں یا مختلف کھانے، الگ الگ رنگ اور قسم کے الگ الگ شکل اور مزے کے اور الگ الگ تاثیر اور ذائقہ کے ایک ہنڈیا میں سے خود بخود نکل کر الگ الگ برتنوں میں سلیقے کے ساتھ جم جائیں۔ یا یوں کہو کہ چھاپے خانے میں خود بخود ایک دھماکہ ہو اور خود بخود ایک ڈکشنری تیار ہو کر باہر آ جائے۔ نہ کوئی مرتب کرنے والا ہو، نہ کاتب و کمپوزیٹر ہو، نہ مشین ہو، نہ بائینڈر ہو، خدا کی قسم کیسی بے عقلی کی بات ہے"۔

ہم نے کہا: "ہمیں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول یاد آتا ہے۔ انھوں نے ایک منکرِ خدا سے کہا تھا کہ اگر خدا نہیں ہے تو مرنے کے بعد جو تمھارا حشر ہوگا وہی ہمارا ہوگا لیکن اگر ہمارے ایمان اور عقیدے کے مطابق خدا ہوا تو ہم تو ان شاء اللہ جنّت میں ہوں گے مگر تم کفِ افسوس ملتے ہوئے دوزخ کی خوراک بن جاؤ گے۔ کیسا عاقلانہ جواب ہے۔ ہمارا ایک دہریہ دوست بھی کبھی کہہ بیٹھتا ہے "یار ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کہیں سچ مچ خدا ہوا تو ہمارا تو بیڑہ غرق ہو جائے گا"۔ گویا انسان کا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ خدا کو مانا جائے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ نقصان سے بچنا چاہیئے اور نقصان بھی کیسا خوفناک، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مسلّط ہو جانے والا، جس کی تلافی مرنے کے بعد ہو ہی نہیں سکتی"۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میاں کلیم بھی غسل سے فارغ ہو کر آ گئے، ان کے پیچھے پیچھے ملازمہ ایک بڑی سی ٹرے میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر داخل ہوئی۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ناشتہ کر کے آئے ہیں لیکن میاں کلیم کے خلوص کے سامنے ایک نہ چلی۔

ناشتہ کے دوران میاں کلیم نے کہا "کل کالج کے پارک میں آپ نے کچھ مغربی مفکرّین کے اقوال سنائے تھے۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ ان سے مرعوب ہیں، ان کے سامنے مغرب ہی کے مفکرّین اور سائنس دانوں کے اقوال پیش کئے جائیں تو ان کی ہدایت پا جانے کی بہت اُمید ہو سکتی ہے۔ جب یہ لوگ مغرب والوں کی باتیں بغیر دلیل ہی کے مان لیتے ہیں اگر ان کی مدلّل باتیں کہی جائیں تو قرین قیاس ہے کہ ان کا عقیدہ صحیح ہو جائے۔ اسلیئے میں نے خوب تلاش و جستجو کے ساتھ مغربی سائنس دانوں کے اقوال اکٹھا کئے ہیں۔ آپ لوگ چائے سے فارغ ہو جائیں تو آپ کو بھی سناؤں"۔

شمیم اختر کے منہ سے بے اختیار تعریفی کلمات نکل گئے: "واہ واہ کلیم صاحب حقیقت میں آپ نے یہ کام ایسا کیا ہے، جس کی جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے۔

ہم نے بھی گلاب جامن کو حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے کہا: "جو کام ہوا تجھ سے وہ رستم سے نہ ہوتا"۔

میاں کلیم کی بات سن کر چائے پینا دشوار ہو گیا۔ جیسے تیسے بڑے بڑے گھونٹ چائے کے لئے اور چائے ختم کر کے میاں کلیم پر زور دیا کہ وہ

ہمیں اپنے کارنامے سے مستفید فرمائیں۔ میاں کلیم مسکراتے ہوئے اُٹھے اور الماری سے اپنی خوبصورت سی بیاض اُٹھا لائے پھر یہ کہہ کر کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو یا ان اقوال کے اکٹھا کرنے میں کوئی خامی رہ گئی ہو تو اس سے مجھے ضرور آگاہ کریں۔ انھوں نے اپنی بیاض کھول کر پڑھنا شروع کیا:

کینڈا کے پروفیسر طبیعات جو ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی۔ ہیں کہتے ہیں کہ: "اس وقت دنیا میں چند خیالات کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ پہلے نمبر پر وہ لوگ ہیں جن کے خیال میں اس دنیا کا وجود محض ایک فریب نظر یا واہمہ ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ طبیعات کے پروفیسر کا کہنا ہے کہ اگر ان لوگوں کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس کا یہ مطلب نکلے گا گویا صورت حال اس دنیا کی یہ ہے کہ خیالی گاڑیاں جو بظاہر فرضی مسافر سے لدی ہوئی ہیں۔ غیر حقیقی دریاؤں کو ساختہ پرداختہ پلوں کے ذریعہ عبور کر رہی ہیں۔ یعنی یہ سب خیالی پلاؤ ہیں۔ دوسرے نمبر پر وہ لوگ آتے ہیں جن کے نزدیک یہ کائنات از خود عدم سے وجود میں آگئی ہے۔ اس خیال کے متعلق پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسی لغو۔ گڑھی ہوئی مفروضہ بات ہے جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں۔ حرکات حرارت کے قوانین سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دنیا بتدریج انحطاط اور تنزل کی طرف جا رہی ہے۔ خود انسان کو دیکھیں پہلے لوگوں میں جو قوتیں تھیں، اب نہیں رہیں۔ لہٰذا ایک وقت آنے والا ہے کہ موجودات اپنی حرارت کھو بیٹھیں گی۔ توانائی اور قوت فنا ہو جائے گی اور زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ دمکتا ہوا

سورج۔ یہ ستارے اور روئے زمین سب اس بات کے گواہ ہیں کہ اس کائنات کی ضرور کوئی ابتداء ہے کہ یہ پہلے نہ تھی، پھر وجود میں آئی اور خود بخود نہیں بلکہ یہ کسی ذات کی تخلیق کا کرشمہ ہے جو ازلی ابدی، علیم و قدیر ہے بھلا یہ انتظاماتِ ارضی و سماوی محض اتفاقیہ پیدا ہو گئے۔ ہرگز تصور میں نہیں آسکتا"۔

سائنسدان میرٹ سٹینلے کان ڈان۔ پی ایچ ڈی کہتا ہے:

"کئی سال ہوئے پنسلوانیا کے ایک غیر آباد اور سنسان راستے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے خوبصورت پھولوں سے لدا ہوا گلاب کا ایک پودا دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے بڑے اہتمام سے اُسے یہاں لگایا ہے۔ اور بڑی محنت سے اسکی کانٹ چھانٹ کی ہے کچھ عرصہ بعد پھر وہاں جانا ہوا تو اس پودے کے پاس جھاڑ جھنکار کھڑے تھے۔ قریب ہی ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا اور غیر آباد تھا۔ اب اس بات کا تو کوئی امکان نہیں کہ یوں کہا جائے کہ اس گلاب کا پھول یا ٹہنی ہوا کے ذریعہ اُڑ کر یا پانی میں بہہ کر یہاں خود بخود آگئی ہو گی۔ جس نے یہاں آکر جڑ پکڑ لی تھی یا کسی پرندے کی بیٹ یا چوہے کی مینگنیوں کے ذریعہ اس کی تخم ریزی ہو گئی ہو گی۔ میرے وجدان نے کہا۔ یقیناً یہاں کوئی خوش ذوق آدمی کبھی آکر رہا ہو گا۔ اس نے اپنا مکان بنایا۔ اس نے گلاب کا پودا لگایا۔ اسی نے اسکی دیکھ بھال اور کانٹ چھانٹ کی۔ حالانکہ نہ تو یہ جھاڑیاں میرے سامنے لگیں، نہ گلاب کا پودا سامنے لگایا گیا، مگر ذوق شہادت دیتا

ہے کہ کسی نے اسکو خوبصورتی سے لگایا ضرور تھا۔ یہ کسی نہ کسی انسانی ذہن کی کارفرمائی تھی۔ یہ بات ہرگز نہیں مان سکتا کہ گلاب کا پودا خود بخود لگ گیا اور خود بخود صفائی ہوگئی اور پھر خود بخود سب کچھ اُجڑ کر اسکی جگہ جھاڑی اگ گئی۔ جو شخص ایسا کہے تو میں اُسے عقل سے خارج قرار دوں گا۔ اس چھوٹی سی مثال سے میری غرض یہ ہے کہ آسمان کے یہ تارے جو ایک خاص فاصلے اور خاص خوبصورتی سے جھلملا رہے ہیں، خود بخود نہیں لگ گئے بلکہ کسی ماہر نے انھیں آسمان پر جگمگایا ہے ___ رہا علم سائنس، اس کی بنیاد تجربے پر ہے اس میں ہر وقت بشری کوتاہیوں اور خامیوں کا امکان رہتا ہے۔ اس کی ابتداء اور انتہا قیاس پر ہے۔ جس میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک سائنسدان دوسرے کے اصول کو توڑ دیتا ہے۔ مگر مظاہر فطرت کے اصول ٹوٹ ہی نہیں سکتے وہ جوں کے توں برقرار رہتے ہیں سائنس تو دراصل مظاہر قدرت کے تجزیے کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس کے ذریعہ خدا کے وجود کا پتہ چلتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قادرِ مطلق خالق کی ہستی موجود ہے"۔

جان کلیوی لینڈ پی۔ ایچ۔ ڈی ماہر ریاضی کہتا ہے:

کائنات کی رنگارنگی اور بوقلمونی اور اس کا حیرت انگیز جامع نظام بتاتا ہے کہ یہ ہستی فہم و ادراک کی اس اعلیٰ ترین قوت کی مالک ہے جسے دوسرے الفاظ میں عقل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن عالمِ مادّیات میں عقل کو بروئے کار لانے کے لئے ارادہ کی ضرورت ہے۔ عقل کے پیچھے عزم وارادہ

نہ ہو تو طب و نفسیات اور دیگر علوم کے مسائل کی عقدہ کشائی ممکن نہیں۔ عقل و عزم کا یہ اشتراک کسی ذات اور کسی ہستی کے بغیر قابلِ تسلیم نہیں گویا ایک خاص قوّت، خاص حکمت اور خاص علم والی یکتا ذات نے اپنے ارادے کے مطابق اس عالم کو پیدا کیا ہے جو ہر جگہ موجود اور حاضر و ناظر ہے۔ یعنی ہم تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ خدا ہے اور وہی کائنات کا خالق مالک، ناظم اور مقتدرِ اعلیٰ ہے"۔

لارڈ کیلون کا قول ہے: "اگر آپ غور و فکر سے کام لیں تو سائنس آپ کو یہ ماننے پر مجبور کر دے گی کہ خدا ہے"۔

ماہر ریاضی ڈانلڈ ہنری پورٹر کہتا ہے: "آپ فطرت کے قوانین کے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں، ایک سائنسدان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک وہ تصوّر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں ناظم اور اس کے بنانے والے اور حرکت میں رکھنے والے یعنی خدا کے وجود کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ یہ صرف خدا ہی کی قدرت ہے جو اس کائنات کی ہر شے میں جلوہ گر نظر آتی ہے"۔

ایڈورڈ لوتھر کیسل سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ماہر حیوانات و حشرات الارض اپنے طویل مضمون کو ختم کرتے ہوئے کہتا ہے: "آخیر میں میں اپنی اسباب کو پھر دوہراؤں کہ اگر کھلے دل و دماغ کے ساتھ سائنس کا مطالعہ کیا جائے تو آدمی کے لئے خدا پر ایمان لانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا"۔

کلیم کچھ اور بھی اقوال سنانے والے تھے مگر ہم نے قطع کلام کرتے ہوئے ہوئے کہا:

ٹھیک ہے کلیم صاحب۔ ہم اور دُنیا کے بڑے بڑے سائنسدان اور مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کا خالق اللہ تعالیٰ شانہٗ ہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دہریوں کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟ ان کے نزدیک یہ دُنیا کیسے وجود میں آئی؟"

میاں کلیم ہنس کر بولے: "ان کا خیال یہ ہے کہ کئی کھرب سال پہلے خودبخود ایک دھماکہ ہوا، اور اس دھماکہ سے دنیا بن گئی"۔

دہریوں کے اس نظریے پر ہنسی تو ہمیں بھی آگئی مگر ضبط کر کے بولے: "کوئی دلیل ہے اس کی؟"

"دلیل کیا ہو گی؟" میاں کلیم نے وضاحت کی "محض خیال سے کہتے ہیں۔ جیسے ڈارون کا دعویٰ ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ خود اس کو بندر کی اولاد بننے کا شوق تھا لیکن تمام بنی نوع انسان کو بندر بنا دیا۔ یہی اس کا مسئلہ ارتقاء ہے یعنی انسان روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ اب اس سے پوچھنا چاہیئے کہ بندر سے انسان بنا، اب انسان سے ہاتھی کب بنے گا؟ اس کے قول کے مطابق ترقی تو ہوتی ہی رہے گی۔ یہ محض خیالی خوش فہمیاں ہیں جن کے ذریعہ مذہب سے ناواقف لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ بلّی پہلے اُونٹ تھی اب گھستے گھستے بلّی بن گئی اور دلیل دینے کے بجائے اس بات پر زور دوں کہ یہ میرا نظریہ ہے اور آپ کو میرا نظریہ

اس لئے ماننا چاہیئے کہ میں عقلمند ہوں اور میری عقل کی دلیل یہ ہے کہ میں نے لکڑی کی بیل گاڑی بنائی ہے۔ جب بیل گاڑی بنا سکتا ہوں تو پھر نظریہ کیوں نہیں بنا سکتا۔ لہٰذا میرا نظریہ وزنی ہے کہ بلّی پہلے اُونٹ تھی۔ یہ بات عقل میں بھی آتی ہے کہ چیزیں گھس گھس کر مختصر ہو جاتی ہیں۔ کھربوں سال تک مسلسل گھسنے کے بعد اُونٹ کا بلّی بن جانا ناممکن نہیں۔ جب آپ یہ مانتے ہیں کہ مجھے بیل گاڑی بنانا آتی ہے تو میرا یہ نظریہ بھی ماننا پڑے گا اور اگر آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں آپ کو جاہل قدامت رجعت پسند اور اولڈ کہوں گا۔"

شمیم اختر کے چہرے پر پہلے سے مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ میاں کلیم کی بات پر ہم سب کی زور سے ہنسی نکل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ خدا اس قسم کی اُلٹی سیدھی توجیہات کیا کرتے ہیں اور جو شخص ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے تو اُسے اسی طرح جاہل اور بے وقوف کے خطابات سے نوازتے ہیں۔ کچے ذہن خصوصاً طلبہ اپنے آپ کو ان خطابات سے محفوظ رکھنے اور خود کو پڑھا لکھا، ترقی پسند ثابت کرنے کے لئے آنکھیں بند کر کے اُن کی بات پر آمنّا وصدّقنا کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں، ہزاروں سائنسدان خدا کے وجود کے قائل ہیں تو ہمارے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ محدودے چند ذہنی مریضوں کی بات مانیں۔ ہم کو اپنا مذہب ترک کئے بغیر اُن سائنسدانوں کی جو وجودِ باری تعالیٰ سے متاثر ہیں دل سے حمایت کرنی چاہیئے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے

ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کے اعتقادات و قوانین کی اشاعت کریں اور اس کے لئے ہر ممکن سعی سے گریز نہ کریں۔ دنیا کے سب ہی مذاہب اپنی اشاعت میں سرگرداں ہیں اور تمام اقوام اسلام کے مٹانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ کیا ہم ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں اور اپنے مذہب کو اٹھا کر ان کی گود میں ڈال دیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ہم نے اپنے مذہب کو دل سے قبول کیا ہے۔ اسلام ہمارا اپنا مذہب ہے اسکی حمایت اور نصرت ہمارا فرض ہے اور اس کے دلائل پر مسلمان ہی یقین نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟"

میاں کلیم بولے "جی ہاں۔ ذرا سوچئے تو سہی، اگر خدائے تعالیٰ کو نظر انداز کر کے اس عالم کائنات کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ سب کچھ از خود ہے تو لازمی طور پر اس کائنات کی ہر چیز میں مادۂ تخلیق ماننا پڑے گا اور یہی کہا جائے گا کہ ان میں تخلیق کی صفت ہے۔ آخر خلقت کا کوئی نہ کوئی خالق تو ہوگا۔ اس لحاظ سے کائنات کی ہر چیز کو لفظ خدا سے تعبیر کرنا ہوگا کیونکہ جب ہر چیز میں تخلیق کرنے کی صفت موجود ہے تو وہ خالق کہلائے گی ــ نہیں جناب! دہریوں کا گڑھا ہوا نظریہ کب چلے گا؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خالق مافوق الفطرت کا مالک بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ مادّی بھی ہو۔ ایسے مہمل تصوّر کو دور ہی سے سلام"۔

شمیم اختر کہنے لگے "آپ کو یہ بات تو معلوم ہو گی کہ کھجور کے درختوں میں ایک نر ہوتا ہے اور ایک مادّہ۔ نر میں پھول آتا ہے جیسے زیرہ کہتے ہیں

زیرے کو مادّہ کے پھول پر ڈالتے ہیں اس طرح نر و مادّہ کا اختلاط ہوتا ہے اور اُس کے بعد پھل اور کھجور آتے ہیں یہ طریقہ تابیر النخل کہلاتا ہے۔ اور ہاں۔ نر و مادہ صرف کھجور ہی کے درخت میں نہیں بلکہ ہر درخت اور پودے میں پائے جاتے ہیں۔ کوئی نر ہے تو کوئی مادّہ ہے۔ نر پیڑ کے زیرے کو بھڑ تتیے، کیڑے مکوڑے اور مختلف حشرات الارض اپنے پیروں، پروں اور جسموں پر لپیٹ کر مادہ پیڑ تک پہنچا دیتے ہیں اور اس طرح پھول اور پھل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انجیر کے پھول میں بھڑ گھس جاتی ہے، بعض مرتبہ مر بھی جاتی ہے مگر جو کام قدرت نے مقرر کر دیا ہے وہ جاری رہنا ہے۔ اس لئے دوسری بھڑ آتی ہے اور وہ نر انجیر کے زیرے کو اپنے پیروں اور پروں کے ذریعہ مادّہ انجیر تک پہنچاتی ہے۔ امریکہ میں انجیر کے درخت لگائے گئے تو پھل ہی نہیں آئے آخر بھڑوں کو وہاں لے جاکر چھوڑا، تب پھل آنے شروع ہوئے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو نہ از خود ممکن ہیں اور نہ کسی انسان کی منصوبہ بندی کے ذریعہ عمل میں آتی ہیں۔ بلکہ لامحالہ ایک صاحبِ حکمت قادرِ مطلق ذات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں کہ اُس نے جو قانون بنا دئیے وہ اٹل ہیں ان میں نہ کسی ترمیم کی گنجائش ہے اور نہ اضافہ کی "۔

میاں کلیم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے: "آ بیٹے۔ اس ضمن میں ذرا حکماء اور فلاسفہ کی تحقیقات پر غور کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ سورج ہماری زمین سے تین لاکھ تیس ہزار گنا بڑا ہے۔ لیکن آسمان کے سامنے سورج کتنا نظر آتا ہے؟ جیس) آسمان) پر سورج ایک ٹکیہ کی طرح

دکھائی دیتا ہے، ذرا سوچیں تو سہی کہ بذاتِ خود وہ آسمان کتنا بڑا ہوگا۔ بھلا اسکی وسعت اور لمبائی اور چوڑائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے؟ ہماری زمین تو آسمان کے سامنے مکھی کے پر سے بھی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہوگی۔ اس طرح برسات میں بادل ختم ہونے کے بعد کبھی کبھی آسمان پر کئی رنگ کی کمان نما ایک دھاری نظر آتی ہے جسے قوس و قزح یا دھنک کہتے ہیں۔ یوں ہی رات کے وقت ستاروں کی ایک سڑک سی نظر آتی ہے، اُسے کہکشاں کہا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس قوس و قزح اور اس کہکشاں میں ایک ایک ملین سورج یعنی دس لاکھ سورجوں کی برابر کے تارے ہیں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کائنات میں ایک لاکھ کہکشاں ہیں۔ اب اندازہ کر لیجئے آسمان کی وسعت کا۔ پھر یہ سوچئے کہ یہ سماوی کرے خود بخود وجود میں آسکتے ہیں؟ اگر خود بخود وجود میں آتے تو کبھی کے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے اور ان کے ٹکڑے زمین پر آکر گرتے تو یہ زمین دب کر سرمہ ہو جاتی۔ اس لئے کہ ایک ایک ستارہ اتنا بڑا ہے کہ زمین پر سرپوش کی طرح آجائے۔ اور یہی نہیں۔ ان میں ثوابت ہیں جو اپنی جگہ پر اس طرح قائم ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوا ہو۔ کچھ سیارے ہیں جو چلتے پھرتے ہیں۔ ذرا ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر دیکھو۔ کس قدر ستارے ہیں؟ آخر کون ہے جو اُنھیں ٹکرانے سے باز رکھے ہوئے ہے۔ آخر یہ کس کے حکم کی تعمیل میں لگے ہوئے ہیں؟ جب سے پیدا ہوئے، آج تک ان کی چال میں فرق نہیں آیا۔ آفتاب تو ہم لوگ روز ہی دیکھتے ہیں۔ کسی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہوا دیکھا ہے کہ فلاں سن، فلاں دن

فلاں وقت آفتاب ایک جگہ ہی پر دو تین گھنٹے تک ٹھہرا رہا۔ چل کر ہی نہ دیا۔ یا آٹھ روز تک محض رات ہی رات رہی۔ دن ہی نہ آیا۔ یا آٹھ روز تک محض دن ہی رہا۔ پھر معمول کے مطابق رات دن ہونے لگے۔ خود بخود میں تو کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا ہے۔ سمتوں کا، رفتار کا، وقت کا تعیّن نہیں ہوتا۔ گھر کا کوئی منتظم نہ ہو تو کوئی چیز کہیں پڑی ہے۔ کوئی چیز کہیں، ایک چیز خراب ہو رہی ہے تو دوسری ٹوٹی پھوٹی پڑی ہے۔ ہر طرف مکڑی کے جالے اور گرد و غبار ہے۔ گھر کی حالت منتظم نہ ہونے کی وجہ سے چند ہی روز میں خراب و خستہ ہو جاتی ہے۔ دہریوں کی بات کے مطابق چونکہ کائنات کا کوئی منتظم نہیں، اس لئے اُسے بھی خراب و خستہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر نظامِ عالم خواہ ارضی ہو اور خواہ سماوی، چاہے شمسی ہو اور چاہے قمری حیرت انگیز حساب کے تحت چل رہا ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب ایک ذات واجب الوجود کے تابع اور مسخّر ہیں اور ان کی یہ مجال نہیں کہ ذرّہ برابر بھی اس کی حکم عدولی کر سکیں۔"

"اور جس سائنس پر ہم اتنا اتراتے ہیں" شمیم اختر نے کہا۔ "وہ بھی یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ مادّہ جو دھماکے سے ایک سو دو عناصر میں تقسیم ہوا، کہاں سے آیا؟ آخر اُس مادّہ کا کوئی خالق تھا یا نہیں؟ یا اُس کو وجود میں لانے کے لئے کسی دوسرے مادّے میں دھماکہ ہوا تھا؟ آخر اسکی تخلیق کیسے ہوئی؟ اُسے بھیجا کس نے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مادّے نے یہ پیغام پہنچایا ہو کہ میں خود بخود تھا؟ اس کا قاصد کب، کہاں اور کس

کے پاس آیا؟ کیا گونگا بہرہ اور بے جان بے حس مادّہ کوئی پیغام دے سکتا ہے؟ منکرین خدا بتائیں کہ انھیں کس طرح اور کس ذریعہ سے علم ہوا کہ پہلے مادہ تھا۔ اور پھر یہ ہوا۔ پھر وہ ہوا اور کائنات وجود میں آگئی۔ محض اپنے تخمینے اور ظن پر اتنا اعتماد اور بھروسہ ٹھیک نہیں۔ اندازے اور ظن کو دوسرے آدمی کا ظن وگمان توڑ سکتا ہے مثلاً اگر کوئی یہ کہہ دے کہ جناب مادہ بالکل تھا ہی نہیں تو منکرینِ خدا اس کے سابقہ وجود کو کس دلیل سے ثابت کریں گے؟" کیا کوئی ایسی قوی دلیل ہے جس سے یہ معرفت حاصل ہو جائے کہ جو کچھ منکرین کا اندازہ ہے وہ واقعی یقینی بات ہے۔ یوں ہی کوئی شخص منکرین سے کہہ دے کہ ہم آپ کی بات بغیر دلیل کے نہیں مانتے اور آپ دلیل سے سمجھا نہیں سکتے تو ایسے معمّہ پر زندگی اور کائنات کا دارو مدار رکھنا کہاں تک قرین عقل ہو سکتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ منکرین کی یہ بات ماننے کے قابل ہی نہیں ہے۔ یہ مادّہ پرستوں کی وہمی باتیں ہیں۔ جب کہ وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ دلیل سے کہتے ہیں۔ ان کے پاس معرفتِ الٰہیہ کی دس بیس نہیں لاکھوں دلیلیں موجود ہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز شاہد دگواہ ہے"۔

ہم نے کہا: "اچھا کلیم میاں! کل ذرا اپنے دوست مسٹر اے۔ قدیر کو ہمارے ہاں لیکر آئیں۔ ہم ان سے چند سوالات کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ بھی محظوظ ہوں گے۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ دیکھئے۔ اے۔ قدیر صاحب کو ضرور لائیں۔ ہم آج رات کچھ سوالات مرتب کرلیں گے۔ اور کل ان سے پوچھیں گے۔ دیکھیں کیا جواب دیتے ہیں.......... السلام علیکم"۔

باب ۱۱

صبح کو ہم اپنے ساتھیوں کا انتظار کر ہی رہے تھے کہ میاں کلیم اور شمیم اختر مسٹر اے۔ قدیر کو اپنے ہمراہ لے کر آ گئے۔ ہم نے ان لوگوں کو بالا خانے پر بچھے ہوئے قالین پر لے جا کر بٹھایا۔ مزاج پرسی کے بعد شمیم اختر نے کہا، "لیجئے جناب کل کے وعدے کے مطابق مسٹر اے۔ قدیر کو لے آیا ہوں آپ نے کہا تھا کہ چند سوال پوچھیں گے۔ میں نے ان سے تذکرہ کیا تھا۔ یہ بھی شوق ظاہر کر رہے ہیں۔ اب آپ وہ سوالات ظاہر فرمائیں۔"

ہم نے کہا "ایسی جلدی کیا ہے؟ پہلے آپ لوگ چائے تو پی لیں۔"

"نہیں۔ نہیں" میاں کلیم جلدی سے بولے "ہم لوگ چائے پی کر آئے ہیں۔"

"اس وقت تو آپ سوالات پوچھیں" شمیم اختر نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "رہ گئی چائے تو وہ بھی پلا دیں۔ اب تو ہم سب کا پیٹ خوب بھرا ہوا ہے۔"

"آپ کی مرضی" ہم نے کہا اور مسٹر اے۔ قدیر کی جانب گھوم کر بولے۔ "مسٹر اے۔ قدیر! آپ ہمارے سوالات کو خوب غور سے سننے اور سمجھنے کے

بعد جواب دیں۔ اور اگر ابھی جواب نہ دے سکیں تو پھر کبھی سہی۔ اس سلسلہ میں اگر آپ چاہیں تو اپنے ہم خیال لوگوں سے بھی ہمارے سوالوں کے جواب معلوم کر سکتے ہیں"۔

"ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ زمین کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ دوسرا سوال سمندر جو موجیں مارتا ہے، اُسے کس نے ٹھہرا رکھا ہے؟ تیسرا سوال "بادلوں کا ایک خاص نظام ہے یہ کس نے قائم کیا؟ چوتھا سوال "رات کی ایک مخصوص حد تک تاریکی کس نے ٹھہرائی ہے؟" پانچواں سوال "کیا موجوں پر کسی انسان کی اتنی حکمرانی ہے کہ وہ ان کو حسبِ ضرورت کم یا زیادہ کر سکے؟" چھٹا سوال "صبح و شام پر کوئی انسان حاکم ہے؟" ساتواں سوال "اس آسمان کے کناروں پر کس کا قبضہ ہے؟" آٹھواں سوال "کیا سمندر میں ہر جگہ نہ ہیں کوئی شخص حکومت کرتا ہے یا کوئی ایسا شخص ہے جس نے سمندر کی تہہ کے چپّہ چپّہ کا سراغ لگا لیا ہو؟ نواں سوال "موت سے کون بچاتا ہے؟" دسواں سوال "زمین کی صحیح صحیح چوڑائی کسی کو معلوم ہے؟" گیارہواں سوال "روشنی کا مسکن اور منبع کہاں ہے؟" بارھواں سوال "ہوا کی ابتداء اور انتہا کیا ہے اور یہ کہاں تک جا کر واپس لوٹ آتی ہے؟" تیرھواں سوال "دن کے وقت تاریکی کہاں چلی جاتی ہے اور رات کو اُسے کون واپس لاتا ہے؟" آپ تو محض سبب بتائیے، خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ اور یہ بھی بتلائیے کہ کسی انسان کے قبضۂ قدرت میں تاریکی کا بڑھانا گھٹانا ہے یا نہیں"۔ چودھواں سوال "بجلی اور رعد پر کوئی والئیٹر مقرر ہے؟ اگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے تو غیر آباد زمین پر سمندر

میں، دریاؤں میں بارش کیوں ہوتی ہے؟ آخر وہاں بارش کی کیا ضرورت ہے؟ جس بیابان میں انسان اور جاندار نہیں بستے وہاں بادل کیوں گرجتے ہیں؟ اور ہاں، جانور تو ریگستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ وہاں یہ بادل خود ہی نہیں جاتے یا کوئی بھیجتا ہی نہیں؟ پندرھواں سوال "زمین کے بخار کو شبنم کس نے بنایا؟" سولہواں سوال آپ کے نزدیک انسان فاعلِ مختار ہے تو کیا دنیا کا کوئی انسان ثریا ستارے کو اُتار کر نیچے لا سکتا ہے؟" سترھواں سوال "کیا کوئی شخص آفتاب کو روک سکتا ہے؟ اگر سارے انسان عاجز ہیں تو اس عاجز پر کوئی قادر ہے یا نہیں؟" اٹھارھواں سوال "کوئی ایسا شخص آپ کی نظر میں ہے جو آسمان کے قواعد اور وہاں کے مروّجہ قوانین سے واقف ہوا ور اُسے علم ہو کہ وہاں کون کون سی مخلوق بستی ہے؟" اُنیسواں سوال "آپ سب کچھ کر سکتے ہیں تو ذرا بادلوں تک اپنی آواز تو پہنچا کر دکھائیں؟" بیسواں سوال "بجلی کو کوئی منع کر سکتا ہے کہ نہ گرے؟ آخر اس کے گرنے میں جو حکمت ہے، وہ کس نے رکھی؟" اکیسواں سوال "بادلوں یا ستاروں کو کوئی سائنسداں گنوا سکتا ہے؟" بائیسواں سوال "آپ کی عقل و دانش کا خالق کون ہے؟" تیئیسواں سوال "شیرنی کے لئے شکار کا انتظام آپ کرتے ہیں؟" اور آخیر میں چوبیسواں سوال یہ ہے کہ پہاڑی کوّوں کے بچوّں یا اسی نوع کے دوسرے پرندوں کی خوراک کا انتظام کون کرتا ہے۔" اس قسم کے اور بھی بہت سے سوالات ہو سکتے ہیں مگر فی الحال آپ کی اور آپکے ہم خیال دہریوں کی فراست کو سمجھنے کیلئے اتنے ہی سوالات کافی ہیں۔"

سچّی بات تو یہ ہے کہ ہماری یہ آرزو ہی رہی کہ کبھی مسٹر اے قدیر ہماری باتوں کا جواب دیں لیکن جب کبھی ہم نے ان سے کچھ پوچھنا، ان کا سر درد کرنے لگا۔ آج سر میں درد تو نہیں ہوا، البتہ ان کا چہرہ اس طرح اُتر گیا جیسے وہ برسوں کے بیمار ہوں۔

شمیم اختر بولے: "ہم تو آپکے سارے سوالوں کا ایک ہی جواب جانتے ہیں کہ ہمارا خدا ان سب کا خالق و مالک اور رازق ہے۔ وہی حاکم ہے، وہی سب کا علم رکھتا ہے اور سبھی کام اسی کی قدرت سے اسکی مرضی و منشاء کے مطابق ہوتے ہیں"۔

ہم نے عرض کیا: "بہت خوب، مدّعی سست گواہ چست۔ سوالات مسٹر اے۔ قدیر سے پوچھے گئے ہیں نہ کہ آپ سے اور اب یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر جوابات مرحمت فرمائیں"۔

مسٹر اے۔ قدیر بولے: "بھائی میں سوچوں یا نہ سوچوں۔ میری عقل نارسا کی حیثیت ہی کیا ہے۔ دراصل میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ آپ کا نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مجھے صرف ایک اشکال ہے وہ مجھے سمجھا دیں پھر میں اپنے خیالات سے توبہ کر لوں گا"۔

ہم نے کہا ضرور پوچھیئے۔ اگر میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو معلوم کر کے بتا دوں گا"۔

بولے "جس طرح آپنے سوال کیا کہ مادّہ کو کس نے پیدا کیا، اس طرح اگر میں یہ پوچھوں کہ (نعوذ باللہ) خدا کو کس نے پیدا کیا تو کیا جواب ہوگا؟"

شمیم اختر کہنے لگے : "بھائی، مادّہ مخلوق ہے۔ اس کے متعلق پوچھا جا سکتا ہے کہ اس کا خالق اور پیدا کرنے والا کون ہے۔ کیونکہ منکرینِ خدا بھی اس مادّے کو خالق نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ پڑا ہوا تھا۔ خود بخود اس سے عناصر پیدا ہو گئے یعنی مادّے سے خروج مانتے ہیں، خلق نہیں مانتے، لہٰذا جب مادّہ جائے خروج ہوا تو اس کے متعلق سوال کرنا کہ یہ مادّہ کس نے پیدا کیا ہے، عین عقل کے مطابق سوال ہے۔ لیکن خدا کے بارے میں ایسا سوال کرنا غلط اور کم عقلی کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ سوال کرنا کہ اسکو کس نے پیدا کیا، اس لئے غلط ہے کہ مسلمان خدا کو خالق مانتے ہیں اور آپ یہ سوال کر کے اُسے مخلوق بنانا چاہتے ہیں۔ اگر خدا کو کسی نے بنایا یا پیدا کیا ہوتا تو وہ مخلوق ہو گیا ہوتا، اور ہم مخلوق کو خدا نہیں کہتے بلکہ خالق کو کہتے ہیں۔ آپ کا یہ سوال مخلوق کے متعلق تو بجا ہے لیکن خالق کے لئے بالکل بے جا کیونکہ اس سوال سے خالق خالق نہیں رہتا بلکہ مخلوق بن جاتا ہے۔ ہمارے اعتقاد پر ایسا سوال کرنا کم عقلی اور ناسمجھی ہی کی بات نہیں بلکہ خالق کو بھی مخلوق بنانا ہے۔"

اچانک مسٹر اے۔ قدیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ٹپک پڑے ہچکی لے کر بولے : "آپ لوگ گواہ رہیں میں سچّے دل سے تائب ہوتا ہوں اور دل سے کلمۂ طیبہ پڑھتا ہوں لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ آئندہ آپ صاحبان مجھے عبد القدیر کہا کریں اور میرے لئے خدا کے حضور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایمان پر قائم رکھیں اور ایمان ہی پر موت دیں۔ میں غلط سوسائٹی میں اُٹھنے بیٹھنے کے

باعث اپنے آبائی مذہب اسلام سے، جو حقیقت میں سچا مذہب اور نجات دہندہ ہے، بے گانہ ہو گیا تھا۔ آج آپ لوگوں کے سامنے رجوع کرتا ہوں اور ایک بار پھر دل کی گہرائیوں سے کلمۂ طیبہ پڑھتا ہوں"۔

یہ کہہ کر انھوں نے ایسے رقت آمیز لہجہ میں کلمہ طیبہ پڑھا کہ ہم سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ میاں کلیم کہنے لگے "ہمیں تو اُمید ہی نہیں تھی کہ کبھی عبد القدیر صاحب اپنی ہٹ دھرمی سے باز آئیں گے۔ الحمد للہ۔ خدا ہمارے ساتھیوں کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنے ایک بھائی کا ایمان بچا لیا۔ و للہ الحمد"۔

شمیم اختر نے کہا "میاں، ہم کیا اور ہماری باتیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سچے دل کے ساتھ طالب ہدایت ہو تو اُسے ہدایت ضرور ملتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ پانی کے قطرے سے لے کر آسمان کے تاروں تک نظر دوڑاؤ تو ایک نظم و نسق نظر آتا ہے۔ اور اُسی بنیاد پر ایجادات کے قوانین مرتب ہوتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، وائرلیس، ٹیلی گراف نظامِ ہوائی کے ماتحت وجود میں آئے ہیں۔ اگر یہ نظام پہلے سے نہ ہوتا تو بڑی گڑ بڑ مچتی، ریڈیو کبھی بجتا، کبھی نہ بجتا۔ ٹی وی میں کبھی تصویریں آتیں اور کبھی نہ آتیں۔ مگر بجلی کی رو جو فضا میں موجود ہے، ایک ایسے نظام کے تحت ملتی ہے کہ ان ایجادات میں کوئی تخلف نہیں ہونے پاتا۔ ستاروں میں تخلف ہوتا تو کشتیاں اور ہوائی جہاز نہ چلتے اور اگر چلتے تو کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ ستارے ہمیشہ چکر لگا کر اپنے مدار پر وقت مقررہ

پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک ہٹ دھرم آدمی ہی کہہ سکتا ہے کہ اس نظامِ عالم پر کوئی حاکم نہیں ہے۔ ضدّی بچّے کی طرح ہٹ کئے جانے کا کوئی علاج نہیں۔ اس طرح کبھی ہدایت نہیں ملتی۔ حالانکہ عقلِ سلیم کا یہی فیصلہ ہے کہ کائنات کے نظام کو حکمت سے چلانے والا موجود ہے، اسکو ہم مسلمان خدائے وحدہٗ لاشریک سے تعبیر کرتے ہیں"۔

میاں کلیم کہنے لگے "کسی موقع پر اگر کوئی مسلمان یہ کہدے کہ وہ خدا کو بغیر دلیل کے محض عقیدے کے طور پر مانتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کوئی خلافِ عقل بات کہہ رہا ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اتنی بدیہی حقیقت کے لئے منطقی استدلال کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اسی طرح بغیر کسی دلیل کے تسلیم کرتا ہے، جس طرح دھوپ کو دیکھکر بغیر کسی دلیل کے سورج کی موجودگی کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ خدا کا وجود ایک امرِ واقعی ہے اور اس مسلمان کا بغیر دلیل کے خدا کو تسلیم کر لینا، خدا کے عدمِ وجود کی دلیل نہیں ہے۔ کھینچ تان کر بہت سے بہت آپ یہ مطلب نکال سکتے ہیں کہ وہ مسلمان یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں سائنٹیفک طور سے یا اپنی کم فہمی یا کوتاہئ علمی کی وجہ سے اس امرِ واقعی پر دلیل نہیں لا سکتا۔ یہ میری اپنی کمزوری ہے کہ یا یہ طرزِ استدلال عقلی موزوں نہیں ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ میں عقیدے کے طور پر خدا کو مانتا ہوں، اور دراصل وہ بالکل صحیح کہتا ہے"!

اسی دوران میں ملازمہ چائے لیکر آ گئی۔ ہم لوگ فوراً ہی اس پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے برسوں کے پیاسے ہوں۔

باب ۱۴

یہ قصہ جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں، اس کا لب لباب یہ ہے کہ کچھ لوگ خدائے تعالیٰ عز اسمہٗ کی ذات پاک کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو ہماری طرح مجسّم تصوّر کر رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا انسان یا مکان یا باغ یا زمین و آسمان کے نیچے کی کسی شئے کی طرح ہوگا۔ اور شاید ان کو باطل مذہب والوں کی وجہ سے یہ خیال آیا ہو کہ بعض گمراہ لوگ انسانوں کو خدا کہتے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام اور حضرت مریم علیہا السلام۔ بعض جانوروں اور درختوں تک کو خدا تصوّر کرتے ہیں۔ دہریوں نے ان گمراہوں کی باتیں سن کر سمجھا کہ شاید مسلمان بھی مجسّم خدا کو مانتے ہوں گے۔ دل میں یہ غلط تصوّر بٹھا لینے کے بعد وہ دریافت کرتے ہیں کہ خدا کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ نظر کیوں نہیں آتا؟ بغیر دیکھے ہوئے اُسے کیونکر دریافت کرلیں حالانکہ یہ ایسے سوالات ہیں جو ایک مجسّم یعنی ایک جسم و مادّے والی چیز کے متعلق کیے جا سکتے ہیں جب اہل اسلام خدائے تعالیٰ کو مجسّم اور ذو مادّہ ہی نہیں مانتے تو ان سے ایسے

سوال کرنا جو ایک جسم کے متعلق کرنا چاہیئیں، بالکل غلط اور واہیات اور رکیک ہیں۔ ان کے سوالات میں کوئی وزن ہی نہیں۔ ہاں اگر مسلمان دیگر ادیان کی طرح خدا کو کوئی انسان یا جسم تصوّر کرتے تو ان کے یہ سب سوالات صحیح ہو سکتے تھے لہٰذا اہلِ اسلام سے یہ سوالات نہیں کئے جا سکتے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں "ہم خدا پر اس وقت ایمان لائیں گے جب وہ ہمارا کہنا مانے۔ ہم کہیں تو بارش برسا دے۔ ہم کہیں تو سیلاب کو روک دے یا ہمارے کہنے پر کربِ اضطراب کو سکون سے بدل دے، یا فلاں شخص ہم پر ظلم کر رہا ہے اگر وہ رحیم و کریم ہے تو اس ظالم کو قتل کر کے ہمارا انتقام لے، یا وہ ہمارے درد کو ابھی دور کر دے تو ہم اُسے مان لیں گے، ورنہ ہم تو ایمان نہیں لاتے"

اس ساری تقریر کا مطلب یہ ہوا کہ خدائے تعالیٰ ہمارا تابع فرمان ہو جائے۔ جو ہم کہتے ہیں وہ کرتا جائے، تبھی اُسے مان سکتے ہیں۔ اس طرح خدا، خدا نہ رہا۔ تم خود خدا ہو گئے۔ یا یہ مطلب ہوا کہ اب خدا تعالیٰ تمہاری رائے کے مطابق اس عالمِ دنیا اور اہلِ دنیا کو پھر سے لائے اور بنائے۔ گویا تمہاری عقل بھی اس تخلیق و نظامِ عالم میں برابر سے خدا کی شریک رہے، یعنی خدائی تمہاری بھی چلے۔ اسی وقت تم ایمان لاؤ گے۔ حالانکہ انسان کا تو یہ حال ہے کہ اگر کسی سے ذرا سی تکلیف پہنچ جائے تو فوراً کہہ اُٹھے کہ فلاں کی روزی بند۔ فلاں کی ہوا کی ضرورت نہیں۔ فلاں ابھی ابھی مر جائے۔ عورتیں تو رات دن اپنے بچوں تک کو کوسنے سے باز نہیں آتیں کہ تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ تیرے دیدے پھوٹیں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جائے۔ کسی کی آئی تجھے آ جائے۔

بس ماں کی چل جائے تو بچے ہی نہ رہیں۔ یہ خدا کی معرفت اور وجدان کی دلیل نہیں اور نہ ایسا کہنا درست۔ وہی بات ہو جائے گی کہ کسی کبڑے سے لوگوں نے پوچھا "میاں تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارا کُب ٹھیک ہو جائے یا یہ چاہتے ہو کہ سب کبڑے ہو جائیں؟"

کہنے لگا "میرا جی تو بس یہی چاہتا ہے کہ سب کبڑے ہو جائیں"۔

پوچھا "کیوں؟"

بولا "تاکہ یہ کہہ سکوں کہ تم مجھ کو کبڑا کہتے تھے تو اب میں تمہیں کبڑا کہتا ہوں"۔

صرف نفس کی اپنی خواہش پر سبھی کو کبڑا بنا دیا۔ واہ رے انسان تیرا ذہن تخریب میں خوب چلتا ہے۔ اگر تجھے تھوڑا سا بھی اس دنیا کے نظام پر قابو حاصل ہو جائے تو کسی کی دھوپ بند کر دے گا، کسی کا پانی، کسی کو بھوکوں مار دے گا تو کسی کو تن بھی ڈھانکنے کی اجازت نہیں دے گا۔ دو ہی دن میں آدھی سے زیادہ دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔

دیکھیئے، ایک تو علم ہے کسی کو جاننا اور ایک معرفت ہے، اسکی نشانیوں سے پہچاننا۔ ایک آپ کا کپڑا ہے۔ اس کا علم یہ ہے کہ یہ کپڑا کس نے بُنا، کیسے بُنا، کہاں سے آیا؟ اسکی پوری حقیقت کیا ہے۔ یہ میرے پاس کب آیا، کب تک رہا، کب پھٹا؟ ان ساری باتوں کے جاننے کو کپڑے کا علم کہیں گے۔ لیکن آپ نے کوئی نشانی دیکھ کر کہا کہ میں دعوٰی کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ کپڑا میرا ہے۔ تو جس طرح علم سے اپنا ہونا بیان کیا اور اس پر

یقین کر لیا۔ اسی طرح پہچان لینے سے بھی یقین آجاتا ہے اور آپ دعوای کے ساتھ اُسے اپنا کہہ اُٹھتے ہیں ۔ بس یہی معرفت ہے۔

لیکن خدائے قدوس کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا۔ محدود میں لامحدود کی گنجائش نہیں۔ فضول قسم کے سوالات تو اُس وقت کئے جائیں جب اللہ تعالیٰ کے علم اور ادراک کا دعوای کسی مسلمان نے کیا ہو۔ مسلمان تو صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے یعنی دلائل، شواھد، علامات اور بے انتہا نشانیوں سے ہم اللہ تعالیٰ کو پہچانتے اور اس کے وجود کا یقین کامل رکھتے ہیں۔

اس بات کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لئے کائنات پر نظر دوڑائیے آپ کو ایک زبردست نظم و نسق اور ترتیب نظر آئے گی۔ کیا یہ نظم و ترتیب کسی منتظم اور مرتّب ذات کی گواہی نہیں دیتی ؟ یہی قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ اسکی قدرت کا کوئی شمار نہیں۔ جس طرف نظر دوڑاؤ اسی کی کاریگری نظر آتی ہے۔

آئیے ! ذرا بازار تک ہو آئیں ۔ یہ رہی سبزی منڈی۔ اوہو! یہاں تو سبزیوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ بھنڈی۔ توری۔ ٹماٹر۔ ساگ۔ اور دوسری متعدد سبزیاں اپنے اپنے موسم کے مطابق روزانہ ایک خاص مقدار سے یہاں آتی ہیں اور سارے شہر میں تقسیم ہو جاتی ہیں، جس شخص کو جس ترکاری کی خواہش ہوتی ہے، صبح سے شام تک کسی بھی وقت آکر لے جاتا اور پکا کر کھاتا ہے۔ مگر کیا کبھی آپ نے یہ بھی دیکھا کہ سبزی منڈی کی یہ ترکاریاں کسی

گودام میں بھر کر رکھی گئی ہوں کہ اگلے موسم یا اگلے مہینے میں کام آئیں گی۔ نہیں بلکہ جتنی اہلِ شہر کو، خواہ وہ امیر ہوں یا غریب ان ترکاریوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں آکر لے جاتے ہیں۔ اور اگلے روز اتنی ہی تازہ ترکاری اور آجاتی ہے۔ شام تک یا پھر دوسرے دن پھر ختم ہو جاتی ہے۔ غرض جتنی جلدی بگڑنے والی چیز ہے، وہ اتنی ہی جلدی ختم ہو جاتی ہے۔

ذرا انصاف سے بتائیے کہ سبزی بونے والے نے اُسے ایک دو ماہ تک اُگایا تھا، یا کھیت میں ایک دن میں بیج ڈال دیا تھا اور سارے کھیت کو ایک دم پانی دے دیا تھا، یا ایک ایک کیاری کو ہفتوں سیراب کیا تھا۔ پودوں کی نلائی، چھٹائی ایک بار کی تھی یا الگ الگ کئی بار۔ بارش ہر کیاری پر علیحدہ علیحدہ مہینہ بھر تک برسی تھی یا ایک ہی وقت میں بارش نے کھیت کی ساری کیاریوں کو سینچ دیا تھا؟

زمین کا یہ ٹکڑا ایک ہی دفعہ اس میں بیج ڈالا۔ ایک ہی بار پانی دیا گیا۔ ایک ہی وقت میں بارش سب کیاریوں پر برسی۔ اس لحاظ سے تو ترکاری ایک دن اُگنا چاہیئے۔ منڈی میں ایک دو دن بھنڈیاں، توریاں آئیں اور ختم ہو جائیں۔ آخر یہ کون ہے جو شہر کے بسنے والوں یعنی اپنے بندوں کو ایک دو ماہ تک مخصوص ترکاریاں ضروریات کے مطابق بھیجتا اور اُگاتا رہتا ہے۔ کھیت میں آج ایک من بھنڈی اُتری۔ اب تو اُسے اُجڑنا چاہیئے۔ مگر یہ کیا۔ کل پھر وہی ایک من حاصل ہوئی۔ روزانہ اسی ایک اندازے سے اُترتی چلی جا رہی ہے۔ ہر سبزی کا یہی حال ہے۔

انسان کی ضرورت پوری ہورہی ہے۔ ایک ہی بار میں کھیت کی ساری ترکاری بازار میں آجائے تو پڑے پڑے سڑجائے اور چند دنوں بعد وہی ترکاری ڈھونڈنے سے دوا تک کے لئے میسّر نہ آئے۔ اسی طرح انسان کی فطرت ہے کہ وہ ایک ہی ترکاری ہر وقت نہیں کھا سکتا۔ اس لئے ایک مخصوص وقت کے بعد وہی کھیت ہے، وہی بیج ہے، وہی پودا ہے مگر ترکاری نہیں لگتی۔ پودا سوکھ جاتا ہے۔ وہ کون ہے جس نے اسکی روئیدگی کو روک دیا۔ کھیت والا کب چاہتا ہے کہ پھل نہ آئیں۔ مگر اس کا کام تو صرف اتنا تھا کہ ہل چلادے بیج ڈال دے اور وقتاً فوقتاً دیکھ بھال کرے۔ اب اسی انسان کی تربیت کرنے والے نے دیکھا کہ یہ سال بھر تک ایک ہی چیز نہ کھا سکے گا تو دوسری چیز پیدا فرمادی۔ ہے نہ ایک نظام؟ ہے نہ کوئی منتظم؟

اور جس چیز کی تقریباً ہمہ وقت ضرورت ہے، وہ اسی قدر پیدا کی کہ ہر وقت مل سکے۔ پیاز۔ لہسن۔ مرچ۔ دالیں۔ اناج اس انداز سے پیدا فرمایا کہ سبھی سال بھر کھاتے رہتے ہیں۔ نیا آتا رہتا ہے۔ پچھلے کی کھپت ہوتی رہتی ہے۔ دیکھا آپ نے نظامِ عالم؟ اگر گندم کی مقدار میں کریلے پیدا ہوتے تو جناب زندگی دوبھر ہوجاتی۔

ذرا غور فرمائیں۔ ہوا کا انداز دیکھیں۔ انسان کو جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ اسی قدر عام ہے۔ اسکی کوئی قیمت نہیں، ہر جگہ آتی ہے۔ نہ اتنی زیادہ کہ مکان وانسان اڑجائیں یا کام کرنا مشکل ہوجائے۔ اور اتنی کم کہ دم گھٹ جائے۔ یونہی پانی کی حاجت ہے تو اُسے بھی دریاؤں، چشموں اور کنوؤں

میں عام کر دیا۔ اس اعلیٰ ترین نظام قدرت کو نظرِ غائر سے دیکھئے۔ پانی برسا دیا۔ کچھ جانوروں کے لئے جوہڑ اور تالاب رکھ دیئے۔ فرشِ زمین کو حکم دیا کہ اس پانی کو چوس لے! بارش کا پانی فلٹر ہوتا ہوا زمین کے ذرّات میں نچڑتا ہوا نیچے پہنچا۔ اس تختہ کے نیچے ہر جگہ پانی کا دریا بہہ رہا ہے۔ جہاں چاہو، کنواں کھود لو۔ برما لگالو اور پانی نکال کر استعمال کرو۔ انسان کے لئے جس قدر پانی کی ضرورت ہے، اس کا کتنا وافر خزانہ کس خوبی سے محفوظ ترین جگہ پر رکھا گیا ہے کہ کوئی دوسرا موذی انسان اس کو خراب نہ کر دے یا کسی چیز کی آمیزش نہ کرے۔ گھر میں کھود لو۔ برما لگالو اور پاک صاف پانی کنوئیں سے نکالتے رہو۔ اور اپنے استعمال میں لاتے رہو۔ اگر اس تختۂ زمین کو پانی جمع کرنیکا حکم نہ دیتا یا بہت نیچے پہنچا دیتا یا ختم کر دیتا تو آپ کی زندگی اور آپ کا دہریہ پن اور آپ کا انکار سب دھرا رہ جاتا۔ یہ اسی کی رحیمی کریمی ہے۔ اس کا انکار نہ کرو۔ اس کے دلائل و شواھد بے شمار ہیں۔ مان لو۔ ہمارا رُواں رُواں کہہ رہا ہے کہ بے شک وہ موجود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پانی کی تو صرف ایک مثال دی ہے۔ اسی ایک مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ بھلا یہ سب کچھ آپ ہی آپ اتفاقی بات کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، جناب ہرگز نہیں۔

کوّے کے بچّے جب انڈے سے نکلتے ہیں تو ان کا رُواں سفید ہوتا ہے۔ کوّا اور کوّی اُسے دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ تین روز تک اس کے پاس نہیں جاتے دور دور رہتے ہیں کہ ہم تو کالے اور یہ سفید بلا کہاں سے آگئی۔ چوگا تک نہیں دیتے اب ماں باپ تو دور ہوگئے۔ پرورش کون کرے؟ کیسے پڑی ہے کہ ان بچّوں کا

ذمّہ لے ؟ اس وقت اللہ تعالیٰ ذرّات کے بھنگوں یعنی بہت ہی چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کو جو ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں، حکم دیتے ہیں کہ ان بچوں کے منہ میں چلے جاؤ۔ وہ اُڑتے ہوئے بچوں کے پاس جاتے ہیں۔ بچے اپنا منہ کھول دیتے ہیں۔ بھُنگے اندر چلے جاتے ہیں اور اس طرح بچوں کے پیٹ بھر جاتے ہیں۔ تین روز تک یونہی بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ بچے جو ابھی انڈے سے باہر نکل کر آئے ہیں اور ان کے ماں باپ ان سے دور ہیں آخر کس طرح خوراک کے لئے اپنا منہ کھول دیتے ہیں ؟ یہ بات انھیں کس نے سکھائی ؟ ان سے کس نے کہا کہا کہ تمہاری خوراک تمہارے پاس آئی ہے، منہ کھول کر شکم سیر ہو جاؤ ؟ تین دن کے بعد بچوں کے روئیں کالے ہونے شروع ہوتے ہیں، تب ماں باپ کا خوف دور ہوتا ہے اور وہ اپنے بچوں کے پاس آتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تین دن تک ان بچوں کی خبر گیری نہ فرماتا تو بھلا یہ ننھی سی جانیں باقی رہ سکتی تھیں ؟ یہ سب دیکھنے اور سمجھنے کے بعد بھی کوئی اس ذاتِ واحد و یکتا کا انکار کرے تو اُسے آنکھوں کا اندھا اور عقل کا دشمن ہی کہا جائے گا۔ انصاف اور عقل سے کام لیا جائے تو شکوک و شبہات کے سارے بادل چشم زدن میں چھٹ جائیں۔

شیرنی بچّہ جنتی ہے تو بالکل گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔ نہ منہ، نہ ناک، نہ ہاتھ نہ پیر اسکی پیدائش سے تین دن سے سات دن کے اندر اندر شیر آتا ہے اور اس گوشت کے لوتھڑے پر پھونک مارتا ہے۔ اسکی پھونک سے بچّے کے ہاتھ پاؤں۔ منہ، ناک، کان نکلنا شروع ہو جاتے ہیں اور چند

دنوں میں یہی لوتھڑا مجسّم شیر بن کر چلنے پھرنے لگتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بننے والے اعضاء کا مظاہرہ یہاں ظاہر ہیں اعضاء پیدا کر کے کرایا جاتا ہے تاکہ ناسمجھ انسان سمجھ جائے کہ یہ ساری کارروائی اس خالقِ حقیقی کی جانب سے ہے جو ہر طرح پیدا کرنے پر قادر ہے۔

کسی بھی چیز کو لے لو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ حکمت کا باب کھل جاتا ہے۔ حیوانات میں ہاتھی کی سونڈ نہ ہوتی تو وہ کھا پی سکتا تھا؟ ہرن کی پتلی ٹانگیں اور سر پر سینگ نہ ہوتے تو وہ دشمنوں سے بچ سکتا تھا؟ کبھی سوچا کہ انسان کی تین ٹانگیں ہوتیں یا ایک ٹانگ آپ ہی آپ ایک دو بالشت بڑھ جاتی اور ایک چھوٹی رہتی تو کیا ہوتا؟ خود بخود تو یوں ہی ہونا چاہیئے۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ انسان کی ساری انگلیاں برابر کی ہوتیں یا انگوٹھا ہی نہ ہوتا۔ ایسا کوئی جانور ہے جس کی ساخت کسی صاحبِ حکمت، قادرِ مطلق، حکیم و خالق کی شہادت نہ دیتی ہو۔ جو چیز ہے، اس میں کھلی آنکھوں سے ہزاروں حکمتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ حکمت تو موجود ہے اور حکیم کوئی نہ ہو۔ قدرت کا وجود ہو اور قادر کا وجود نہ ہو۔ تخلیق ہو لیکن خالق غائب۔ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔

حکیم، قادر و خالق موجود ہے۔ اسی کا نام خدا ہے۔ وہی معبود و مسجود ہے۔ وہی حی و قیوم ہے۔ وہی پیدا کرنے والا ہے، پرورش کرنیوالا ہے۔ اور مارنے جلانے والا ہے۔ اسی کی کاریگری اور صنّاعی کو دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے ؎

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا ۔۔۔ کیسی زمیں بنائی، کیا آسماں بنایا

باب ۱۳

ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک جوہڑ ہے۔ چہار اطراف سے بارش کا اتنا پانی اس میں جمع ہوجاتا ہے کہ متعدد لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلاتے ہیں اور قریب کھیتوں والے ڈھیکلی کے ذریعہ آبپاشی کر لیتے ہیں۔ پانی میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جوہڑ بالکل ہی خشک ہوجائے۔ اس کے داہنے کنارے پر پیپل کا گھنا درخت ہے۔ گرمیوں میں اکثر لوگ دوپہر کے وقت پیپل کے سائے میں بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔ تنے کے پاس چٹائی پڑی ہوئی ہے۔ ایک روز ہم نے سوچا کہ لاؤ ذرا ہم بھی اسکی چھاؤں کا لطف اٹھائیں۔ وہاں پہنچے تو مسرت کی انتہا نہ رہی۔ دوسرے احباب وہاں پہلے ہی سے براجمان تھے۔ سلیم، شمیم، کلیم اور عبدالقدیر، پیلپیاں چھانٹ چھانٹ کر کھانے اور چھینا جھپٹی میں مشغول تھے۔ اس پیپل کی پیلپیاں شیرینی میں مشہور ہیں۔ سلام کر کے ہم بھی اپنے دوستوں کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ہم نے پوچھا: "آپ لوگ اکٹھے ہو کر اور کوئی پروگرام بنا کر یہاں آئے ہیں؟"

عبدالقدیر بولے "پہلے سے ہم میں سے کسی کا ارادہ آنے کا نہیں تھا۔ اب ہر ایک یہی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ آج جوہڑ پہ چلنا چاہیئے۔ بس یہی ہر ایک کے دل میں خیال آتا رہا اور یکے بعد دیگر ہم سب یہاں جمع ہو گئے۔ آپ کی کمی تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیج دیا۔ بتایئے کیا آپ کا پہلے سے یہاں آنے کا ارادہ تھا؟"

اس عجیب حسنِ اتفاق پر ہم حیران رہ گئے۔ بیساختہ کہا "نہیں جناب بس گھر پر بیٹھے بیٹھے دل چاہا کہ آج پیپل کے سائے میں بیٹھنا چاہیئے اور ہم اُٹھ کر یہاں چلے آئے۔"

میاں کلیم پیپلی کو حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے کہنے لگے "آخر وہ کون ہے جس نے ہمارے ارادے اور پروگرام کے بغیر ہمارے دلوں میں یہ بات ڈالی اور ہم سب کو یہاں جمع کر دیا۔"

اس سے پہلے کہ ہم ان کے سوال کا جواب دیتے، عبدالقدیر جلدی سے بولے: "چند روز پہلے یہی بات کہی جاتی تو میں اُسے اتفاق کہہ کر نظر انداز کر دیتا لیکن آپ لوگوں کی نیک صحبت میں بیٹھ کر میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہمیں یہاں اکٹھا کرنے والی "قادرِ مطلق" ہی کی پاک ذات ہے۔ ہمارے دلوں پر بھی اُسی کا اختیار ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی وقت میں سارے احباب کے دل میں ایک ہی جگہ جانے کا خیال آئے۔ اور تھوڑی دیر میں سب کے سب اکٹھا ہو جائیں۔"

عبدالقدیر نے بات پتے کی کہی تھی۔ ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ

ہدایت ملتی ہے تو کس خوبی کے ساتھ انسان ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے، یہی عبدالقدیر، دو دن پہلے کسی بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے تھے لیکن اب وہی عبدالقدیر ہمیں باور کرا رہا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ اور سمجھنے والا دل ہو تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رضا کے مطابق دنیا کا نظام جاری و ساری ہے۔ ابھی ہم یہ سوچ رہے تھے کہ عبدالقدیر نے ایک ایسی بات کہی، جسے سُن کر ہم سب حیران رہ گئے۔ میاں کلیم اور شمیم اختر کے منہ سے بے اختیار سُبحان اللہ نکل گیا۔ سلیم جو ہم دوستوں میں سب سے زیادہ خاموش طبع واقع ہوئے ہیں، جھوم اُٹھے اور بار بار یہ شعر پڑھنے لگے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

ہوا یہ کہ عبدالقدیر نے ایک پیپلی اُٹھائی اور ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھئے یہ پیپلی ہے یعنی یہ اس درخت کا پھل ہے۔ ذرا اس کو توڑیئے اور اس کے بیج کو جو رائی کے دانے سے بھی چھوٹا ہے، اپنی ہتھیلی پر رکھ لیجئے سب ایک ایک دانہ رکھ لیں اور غور کریں کہ اس پیپلی میں اور اس درخت کے پھیلاؤ اور حجم میں کیا نسبت ہے؟ اس پیپلی کے ذرّے میں یہ درخت موجود ہے۔ آپ اُگا دیں۔ اتنا ہی بڑا درخت اس پیپلی سے نکل آئے گا۔ پھر ہر سال سینکڑوں پیپلیاں آپ کو دیتا رہے گا۔ بھلا یہ آپ ہی آپ پیپل بن سکتا ہے؟ اچھا اب اس پیپلی کو توڑ کر بھی دیکھ لیجئے اس میں کوئی تنا موجود ہے

پتّے، پھول یا ڈالیاں نظر آتی ہیں؟ چیزیں پہلے سے زمین میں موجود ہیں؟ آخر وہ کون ہے جس نے اس پیپلی کو جسم بخشا؟ اس معمولی ذرّے سے اتنا عظیم الشان درخت بنایا؟ اس میں پھل لگائے؟ ماننا پڑے گا کہ صرف ایک ذات وحدہٗ لاشریک کی ہے جس نے ذرّے سے درخت تیار کرکے اس کو وجود بخشا؟ اس معمولی ذرّے سے۔ اس کو منظور نہ ہو تو لاکھ بیج بوئیے، ایک بھی نہ اُگے۔ ذرا یہ پیپلیاں شمار کیجئے۔ ان میں کتنے بیج ہوں گے؟ اگر خود بخود بغیر کسی تصرّف کے یہ بن گئے ہیں تو سب اُگنے چاہئیں۔ اور اگر یہ سب بیج واقعیٔ اُگ جائیں تو روئے زمین پر نہ مکان بنانے کی جگہ ملے اور نہ انسان حیوان کے رہنے کے لئے جگہ نکلے۔ ہر طرف افراتفری مچ جائے۔ جوہڑ کا یہ علاقہ سنسان اور غیر آباد ہے۔ پیپل کے نیچے لاتعداد پیپلیاں پڑی ہیں۔ یہ یونہی پڑی رہیں گی۔ بارش ہوگی۔ زمین بھی یہی رہے گی۔ پھر اگر ہر کام خود بخود ہو جاتا ہے تو سب کی سب پیپلیوں کو اُگنا چاہیئے۔ مگر دیکھ لو، صاف میدان ہے۔ اس پیپل کے قرب جوار میں کوئی دوسرا پیپل نہیں ہے۔ ورنہ یہاں بیٹھنا ہی دشوار ہو جاتا۔ اور اس درخت کی عمر کم از کم چالیس پچاس سال تو ضرور ہوگی۔ جب سے اب تک اس کے نیچے یا اس کے قریب کوئی دوسرا پیپل کیوں نہیں اُگا؟ اس لئے کہ اس درخت کے نیچے تھکے ہارے لوگ آرام کرتے ہیں۔ آخر وہ کون ہے جو لوگوں کے آرام کا انتظام کر رہا ہے؟ اور دوسرے بیجوں کو صرف اس لئے نہیں اُگنے دیتا کہ لوگ بے آرام ہوں گے؟ اگر ایک دو بیج اُگ بھی آتے ہیں تو بڑھنے نہیں دیتا۔ وہ خود بخود مرجھا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہاں کی زمین بھی زرخیز

ہے، اور جوہڑ کے باعث خوراک کا بھی مکمل انتظام ہے اگر ایک چوتھائی بیج بھی بڑھ کر پیڑ بن جائیں تو یہاں پیپل ہی پیپل دکھائی دیں۔ پیپل کے درخت کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آئے۔ کیوں صاحب؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

بس جناب یہ بات تھی جس پر ہم سب کے سب ساتھی عش عش کر اٹھے۔ عبدالقدیر پہلے تو کچھ نہیں سمجھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ہم لوگ انھیں کی بات پر مسحور و مسرور ہو گئے ہیں تو سر جھکا کر شرمیلے اور ندامت آمیز آواز میں بولے "خدا آپ لوگوں کا بھلا کرے۔ جو احسان آپ لوگوں نے مجھ پر کیا ہے، اُسے عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔ میں قعرِ مذلّت میں جا گرا تھا۔ آپ لوگوں نے مجھے گمراہی کے گڑھے سے نکال لیا۔"

میاں کلیم نے کہا "آپ کے اندر جو اچانک تبدیلی آئی ہے، اُسے ہم سب محسوس کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اُس نے آپ کے دل کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ اب آپ خود ہی اپنی طبیعت کا موازنہ کر کے بتائیں کہ پہلے کی حالت میں اور موجودہ حالت میں آپ کو فرق محسوس ہوتا ہے؟"

عبدالقدیر چند لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر کہنے لگے "بچپن میں میرے والدین نے مجھے کلام مجید پڑھوا دیا تھا۔ اسکول میں پہنچا تو نئی نئی باتیں کانوں میں پڑیں۔ ایک ماسٹر صاحب کی سیکھے دار باتوں میں ایسا آیا کہ خدا رسول کو بھی خیر باد کہہ بیٹھا اللہ معاف کرے اور آئندہ ہمیشہ ایسے لوگوں اور ایسی باتوں سے بچائے۔ جب تک میں خدا کا منکر رہا۔ اس وقت تک میرے دل میں بڑی بےاطمینانی، بےچینی اور گھبراہٹ رہتی

تھی۔ سکون تو کسی وقت ملا ہی نہیں۔ اخلاق و آداب اور گناہ و ثواب کی میرے لئے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ خدا کی پناہ۔ ایسے ایسے گناہ کئے کہ کسی کو اگر میرے وہ گناہ معلوم ہو جائیں تو میرے منہ پر تھوکنا بھی گوارا نہ کرے۔ عموماً دل میں دوسرے مختلف خیال آتے تھے کہ فلاں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا اور فلاں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ غرض دشمنی کی باتیں سوچتا تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تمام دنیا کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ کوئی مشورہ دیتا کہ میاں فلاں معاملہ میں صبر کرو۔ خدا کا حکم یہی تھا تو میں دل میں کہتا کہ نعوذ باللہ خدا تو ہے ہی نہیں۔ سارا کیا دھرا انسان ہی کا ہے لہٰذا بیسیوں دشمن بنا لیئے۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی ادھیڑ بُن رہتی کہ انتقام لیا جائے۔ کبھی خود مجھ سے کوئی کام خراب ہو جاتا تو اپنے آپ کو کوستا۔ کئی دفعہ زندگی سے تنگ آ کر خودکشی تک کرنے کا ارادہ کیا۔ میرے کئی ہم خیال دنیاوی تکالیف سے پریشان ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس دنیا کے علاوہ نہ کوئی دنیا ہے اور نہ کسی قسم کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ مصائب آلام سے نجات پانے کا طریقہ ان کے نزدیک اپنے آپ کو ختم کر لینا تھا۔ جنھوں نے خودکشی نہیں کی، وہ شراب کے ذریعہ اپنا غم غلط کرنے پر لگ گئے اس اُمّ الخبائث کے اثر سے تمام اخلاقی حدوں کو پھلانگ گئے۔ خدا کو ماننے والا تو ہر پریشانی پر یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ خدا کو یوں ہی منظور تھا، اور اسی میں ہماری کوئی بہتری ہو گی مگر جو لوگ خدا کو نہیں مانتے، ان کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اپنے

آپ کو زمین پر بوجھ اور دنیا کا ناکارہ ترین انسان سمجھنے لگتے ہیں اور ان کی عقل پر کچھ ایسے پتھر پڑے ہیں کہ کوئی دوست نظر ہی نہیں آتا۔ میرا ایک دہریہ دوست تھا۔ اس کا لڑکا بیمار ہوا۔ اس نے علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور ایک روز وہ لڑکا مر گیا۔ لڑکے کی موت پر میرے اس دوست کا حال بے حال ہو گیا۔ وہ بار بار ڈاکٹر کو الزام دینے لگا کہ اس نے توجّہ سے علاج نہیں کیا۔ غلط سلط دوا دے دی، اس لئے میرا لڑکا ختم ہو گیا۔ اگر وہ توجّہ سے علاج کرتا اور مناسب دوائی دیتا تو میرا لڑکا ہرگز نہ مرتا۔ بس وہ ڈاکٹر سے کینہ رکھنے لگا۔ ہر وقت درپے آزار رہتا۔ ایک مرتبہ تو اُس نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ ڈاکٹر کے لڑکے کو قتل کر کے اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لے لے۔ گھر پہ بیوی کی بھی مار پیٹ کی کہ تو نے ہی اس کمبخت ڈاکٹر سے علاج کا مشورہ دیا تھا۔ نہ اُسے گھر میں سکون تھا اور نہ باہر۔ ایک جہاندیدہ شخص نے کہا بھی کہ میاں، صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا تو اس شخص کو مارنے پر تُل گیا کہ ڈاکٹر اور بیوی کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے اتنے بڑے حادثہ کو ایک ہی جملہ میں ختم کر دینا چاہتے ہو۔ پھر معلوم ہوا کہ دوا فروش کا سر پھاڑ دیا کہ اسکی دوائی نقلی تھی۔ بات پولیس تک گئی تو دنیا اسکی نظروں میں تاریک ہو گئی۔ وہ پولیس اور حکومت تک سے ناراض ہو گیا کہ قاتل ڈاکٹر، قاتل بیوی اور قاتل دوا فروش سے کوئی جواب طلب نہیں کرتا۔ سب کے سب دندناتے پھر رہے ہیں اور مجھ مظلوم و غمزدہ شخص کا ہر ایک دشمن ہو رہا ہے۔ آخر اسی غم میں خودکشی کر لی کہ لعنت ہے ایسی خراب دنیا پر۔"

شمیم اختر نے کہا: "اسی طرح دو آدمی شریک تجارت تھے۔ انھوں نے رقم ملا کر ایک بس خریدی تھی۔ ان میں ایک موحّد تھا اور دوسرا دہریہ۔ اتفاق کی بات پہلے ہی روز ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اور بس چکنا چور ہو گئی۔ دہریہ تو جیتے جی مر گیا۔ بار بار کہتا تھا کہ ڈرائیور نے جان بوجھ کر بس کو ٹکرا دیا ہے۔ اس کو لالچ تھا۔ اس نے مجھے نقصان دینا چاہا اور کامیاب ہو گیا اور افسوس میں تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کو بہت سمجھایا، تاوان تک دلا دیا مگر اُسے اطمینان سے سونا نصیب نہ ہوا۔ اس کی نیند اُڑ گئی۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا اور اس کا دوسرا شریک جو موحّد تھا اس نے ایکسیڈنٹ کا سنتے ہی "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہا اور کہنے لگا: "خدا کو یہی منظور تھا۔ نقصان دیا ہے تو ان شاءاللہ فائدہ بھی دے گا۔" دہریہ کی طرح نہ اس نے ڈرائیور کو موردِ الزام ٹھہرایا، نہ اسکی نیندیں حرام ہوئیں اور نہ وہ نیم پاگل بنا۔ اللہ کے بھروسہ پر اُس نے ایک بار پھر کمر ہمّت باندھی اور از سرِ نو کام شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے نفع دیا جب کہ وہ دہریہ ظاہری اسباب کے پیچھے پڑا رہا۔ اپنے شریک پر شبہہ کر کے اس پر مقدمہ دائر کر دیا اور آخر کار رات دن کی پریشانی نے اُسے بالکل ہی پاگل ہی کر دیا۔ آج کل وہ پاگل خانے میں بند ہے۔"

سلیم بولے: "واقعی خدا کو ماننے والے آرام و سکون سے رہتے ہیں اور خدا کو نہ ماننے والے ہر وقت بے چینی اور بے سکونی کی زندگی گزارتے ہیں۔ مالدار ہو کر بھی ان کو ایک ساعت چین نہیں آتا جب کہ اللہ کو ماننے والا غریب سے غریب بھی یہ کہہ کر کہ کل کا اللہ مالک ہے، پیر پسار کے سوتا ہے وہ نہ گزر رہی ہوئی باتوں پر رنج کرتا ہے اور نہ آنے والے دنوں کے لئے اُسے کسی قسم کی تشویش اور

اور پریشانی ہوتی ہے۔"

میاں کلیم ہم سے کہنے لگے "آپ بہت دیر سے خاموش ہیں۔ کچھ آپ بھی تو فرمائیں"۔

ہم نے کہا "ہم تو آپ لوگوں کی باتیں سن رہے ہیں اور عبدالقدیر صاحب کی بدلی ہوئی حالت پر رشک کر رہے ہیں۔ اچھا یہ دیکھئے۔ جب ہم یہاں آ رہے تھے تو ہمیں راستے میں ایک پودے میں یہ پھول کھلا ہوا نظر آیا۔ کتنا خوشنما پھول ہے۔ اس کی پتیاں کیسی نرم و گداز ہیں۔ اس میں سے کیسی بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔ اور یہ دوسرا کاغذ کا پھول بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک روز بازار میں خرید لیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت جیب میں مل گیا۔ یہ گلاب کے پھول کا چربہ ہے۔ اور بنانے والے نے ایسی ذہانت سے اُسے تیار کیا ہے کہ دور سے بالکل گلاب ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ لوگ دونوں پھولوں کو خوب غور سے دیکھیں اور اس سوال کا جواب دیں کہ پودے کا پھول بنانے والا کون ہے اور کاغذ کا پھول کس نے بنایا ہے؟"

میاں کلیم مسکرائے "صاف ظاہر ہے کہ پودے والے پھول کا خالق اللہ تعالیٰ ہے جب کہ کاغذ کے پھول کو کسی انسان نے بنایا ہے"۔

ہم نے پوچھا "کیوں جناب، کیا دونوں پھولوں کے لئے یہ جواب درست نہیں ہو سکتا کہ انھیں کہیں انسان نے کمال ہوشیاری اور چابک دستی سے بنایا ہے"۔

"نہیں" میاں کلیم نے انکار میں سر ہلایا۔

عبدالقدیر بولے:" کاغذ کے ایسے پھول بلکہ اس سے بھی اچھے پھول ہزاروں انسان بنا سکتے ہیں مگر قدرتی پھول کی ایک پنکھڑی تمام دنیا کے انسان مل کر بھی نہیں بنا سکتے۔ مچھّر اور مکّھی نہیں بنا سکتے" سیب اور ناشپاتی نہیں بنا سکتے۔"

عبدالقدیر ہماری بات کاٹ کر بولے:" اور یہیں پر انسان کی بے بسی اور بے چارگی دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان سے بڑھ کر ارفع واعلیٰ کوئی قدرت والا ہے۔ جب سارے انسان عاجز ہیں تو ان عاجزوں پر کوئی نہ کوئی قادر ضرور ہے۔ جس جگہ انسان کی طاقت ختم ہو جاتی ہے وہاں صرف قادر مطلق کی قدرت ہی کام کرتی ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود ہے اور وہی قادرِ مطلق ہے۔"

سلیم نے تعریفی نظروں سے عبدالقدیر کو دیکھتے ہوئے کہا:" ہاں بھائی۔ عقل و فہم کی بات ہے۔ جتنا غور کرو، اللہ میاں دل کی آنکھوں سے دلائل کی روشنی میں صاف نظر آتے ہیں۔"

"کاش کوئی منکرین سے پوچھے"، میاں کلیم نے کہا:" کیوں منکر صاحب، یہ پتّوں میں رنگ آپ نے بھرا ہے؟ انگور کے خوشنما دانے باغبان نے بنائے ہیں؟ کیلے کے نیچے کوئی پھل ڈالنے والی مشین لگی ہوئی ہے؟ جڑوں کو کس اسکول میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ پھلوں میں صرف وہی مٹھاس کھینچی جائے جو اُن پھلوں کی فطرت میں رکھی گئی ہے؟"

عبدالقدیر بولے:" وہ بے وقوف کیا جانیں کہ بیجوں کی فطرت اور

خاصیّت کس نے پیدا کی ہے۔ ورنہ سو کی سیدھی ایک بات یہ ہے کہ ساری کائنات میں خدا تعالیٰ ہی متصرّف ہیں۔ زندگی کا سکون بھی اسی عقیدے میں مضمر ہے۔ دنیا اور آخرت کی بھلائی بھی ایمان لانے میں ہے یہی خیر و برکت کا چشمہ ہے۔ نجات اُسی ایک دین اسلام میں ہے۔ راحت و چین اسلام کے علاوہ نہ بے دینی میں ہے اور نہ کسی دوسرے دین میں۔"

سلیم نے ایک بار پھر وہی شعر پڑھا "ایں سعادت بزورِ بازو نیست"

ہم نے فوراً لقمہ دیا "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

اور اس طرح جوہڑ کی یہ مجلس اختتام پر پہنچی۔

باب ۱۴

عموماً کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی بڑا منطقی ہے اور منطق کے ذریعہ اپنی بات بڑی جلدی سمجھا دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں بھی شوق ہوا کہ وجود باری تعالیٰ کو علم منطق کے ذریعہ سمجھا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس ضمن میں بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا اور بہت سے صاحبِ کمال علماء سے ملے۔ اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ خدائے تعالیٰ کے وجود کا عقل پر دار و مدار رکھنا عقل کے خلاف ہے۔ یوں کہنا کہ ہماری عقل میں نہیں آتا، ہم کیسے مان لیں، بالکل غلط ہے۔ عام طور پر ایک عاقل کی رائے دوسرے عاقل کی رائے سے مختلف ہوتی ہے۔ بعض دفعہ کسی بات کے بارے میں جتنے منہ اتنی باتیں ہو جاتی ہیں۔ کبھی ایک ہی عاقل کی عقل اپنی پہلی رائے کے مخالف ہو جاتی ہے۔ خود کبھی ایک بات کو صحیح کہتا ہے، پھر خود ہی اسکی تردید کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر بطلیموس کہتا ہے کہ سات آسمان اور فلک الافلاک موجود ہیں۔ فیثا غورث انکار کرتا ہے کہ آسمان کا وجود نہیں، یہ محض حدِ نظر ہے۔ عقل کا لازمی فیصلہ یہ ہوگا کہ ان دونوں میں سے ایک شخص ضرور غلطی پر ہے۔ جب ایک فریق غلطی پر ہوا تو دوسرا فریق بھی کسی جگہ غلطی کر سکتا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ اس سے کبھی

کسی معاملہ میں غلطی ہی نہ ہونے پائے۔ جب اتنے عاقل و فاضل، دانا و فرزانہ حضرات غلطی کر بیٹھے تو امور آخرت کے بارے میں ان کی باتوں کا کیا اعتبار رہا اور محض عقل کو کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں رہی کہ اُسے وجودِ باری تعالیٰ کے تسلیم نہ کرنے کا معیار ٹھہرایا جائے۔ ہاں پہلے تسلیم کرلیں، پھر عقل سے کام لیں، سنجیدگی کے ساتھ سوچیں، کچھ غور و تدبّر کریں تو ضرور فہم و ادراک کی چیزیں کُشادہ ہوجائیں گی۔ خود بخود غیبی طور پر رہنمائی کی جائے۔ عقل کی دُھند، بادل اور تاریکی چھٹنا شروع ہوجائے گی۔ بغیر تسلیم کئے ہوئے محض عقل کو دار و مدار قرار دینا اور چون وچرا کئے بغیر اپنی عقل کے فیصلہ کو مان لینا بالکل غلط ہے ۔۔ آپ کے پاس ایسا کون سا حتمی اور قطعی ثبوت ہے کہ آپ کی عقل کا فیصلہ سو فیصدی درست ہوگا۔

علم منطق کا کہنا ہے کہ تخت کو دیکھ کر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ درختوں کے تنے خود بخود چرنے اور کٹنے کے بعد یہاں کس طرح جمع ہوئے ہوں گے، اور ان میں خود بخود کیلیں کس طرح جڑ گئی ہوں گی۔ بلکہ قدرتی طور پر ذہن میں بنانے والے کا تصوّر آتا ہے۔ ایک ناسمجھ بچّہ بھی یہی کہتا ہے کہ اس تخت کو کسی کاریگر، کسی بڑھئی نے بنایا ہے اسی طرح مخلوقات کو دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ خود بخود ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ فطری تقاضہ ہے کہ ان کے خالق کو بھی مانا جائے۔ اگر ہم دیکھے بغیر تخت بنانے والے کو مان سکتے ہیں تو خالق کائنات کو ماننا بھی لابدی امر ہے۔ ایک اعرابی کا قول ہے کہ اونٹ کی صرف مینگنیاں دیکھ کر اس کے جانے کا یقین آجاتا ہے۔ بکری کی مینگنیاں دیکھ کر بکری کے گزرنے

کا یقین آجاتا ہے۔ اور انسان کے نقش پا سے دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ اُدھر سے انسان گیا ہے۔ بغیر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے اُونٹ اور بکری اور انسان کی آمد ورفت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اور اس حد تک پتہ چل سکتا ہے کہ یقین آجائے تو بھلا برجیوں والا یہ بلند آسمان اور کشادہ راستوں والی یہ زمین اپنے کسی بنانے والے کی نشاندہی نہیں کر رہی؟ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کا یقین نہ کیا جائے۔

اس بات کو علم منطق سے سمجھیئے۔ یہ پوری دنیا اور اس کے احوال متغیّر ہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ جو چیز متغیّر ہو وہ حادث کہلاتی ہے اس لئے یہ دُنیا حادث ہے۔ حادث کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز پہلے نہ تھی۔ اس وقت ہے، لیکن فنا ہو جائے گی اور فنا کے لئے ضروری ہے کہ اس کو فنا کرنے والا بھی موجود ہو۔

دوسری مثال علم منطق کی رو سے یہ دی جا سکتی ہے کہ دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں جوہر یا عرض۔ جوہر وہ ہے جو جسم رکھتا ہو جیسے شجر، حجر، زمین، آسمان، اور عرض اُسے کہتے ہیں جو اپنے قیام میں دوسروں کا محتاج ہو اور بذاتِ خود اس کا کوئی جسم نہ ہو، جیسے رنگ، سردی، سفیدی، تاریکی، گرمی، روشنی — سارے عرض حادث ہیں۔ یعنی فنا ہونے والے ہیں۔ سردی کے بعد گرمی آئی تو سردی فنا ہو گئی۔ تاریکی کے بعد روشنی آئی تو تاریکی ختم۔ اندھیرے کے بعد اُجالا۔ رات کے بعد دن، مصیبت کے بعد راحت، غم کے بعد خوشی، ہر عرض کی آمد سابقہ عرض کو فنا ہے۔ جوہر کو حرکت یا سکون لازم ہے۔ وہ یا تو متحرک ہیں یا ساکن۔

اور حرکت و سکون عرض ہیں۔ لہٰذا جس کو یہ لاحق ہوں اُسے بھی حادث کہا کہا جائے گا۔ اس طرح تمام عالم حادث ہوا۔ ہر حادث کے لئے ایک محدِث کی ضرورت ہے کیونکہ ہر فعل کے لئے فاعل کی ضرورت ہے۔ فعل بغیر فاعل کے نہیں۔ پیدا کرنا بغیر پیدا کرنے والے کے نہیں۔ فنا بغیر فنا کرنے والے کے نہیں۔ جب یہ عالم حادث ہونے کے باعث فنا ہونے والا ہے تو اس کا محدِث یعنی فنا کرنیوالا بھی ضرور بالضرور ہے۔

اگر زمین و آسمان کا طبعی خاصہ ایک ہے تو قسطبین میں سکون اور منطقہ میں سرعت سیر کیوں ہے؟ طبعی خاصہ تو ایک ہوتا ہے۔ زمین کہیں نرم، کہیں سخت، کہیں بلند کہیں پست۔ کہیں کوئی رنگ کہیں کوئی رنگ۔ یونہی شب و روز کا کم زیادہ ہونا اور گھٹنا بڑھنا۔ یونہی انسان اور حیوان باوجود شکل نوعی کے تشخصات میں بے حد اختلاف۔ بھائی بھائی قد میں۔ شکل و صورت میں۔ سیرت میں۔ مزاج میں۔ ساخت میں کس قدر اختلاف ہے کہ ایک آدمی کی شکل، آواز، عادت دوسرے سے نہیں ملتی۔ انسان تو انسان درخت کا پتہ اسی درخت کے دوسرے پتے سے نہیں ملتا۔ ایک ہی پھول کی دو پنکھڑیاں ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ ان کی بناوٹ، جسامت اور رگ و ریشہ میں اختلاف۔ لہٰذا ضرور ایک قادرِ مطلق و مختار کو ماننا پڑے گا۔ جس طرح ایک پتھر کا بغیر ہلانے والے کے خود ہلنا محال ہے۔ اسی طرح بغیر کسی قادر و مختار کے اس عالم میں ان تصرفات کا ہونا محال ہے۔ لازماً ایک ذاتِ قادر و مختار موجود ہے جو جب چاہے آفتاب کی روشنی کو سلب کرلے۔ جہاں چاہے

بارش برسنے دے اور جہاں چاہے نہ برسنے دے۔ انسانوں کی خواہشات اور ضروریات کے باوجود ان کے عزائم کو خاک میں ملا دے۔ آخر وہ کون ہے؟ خالق و مالک اللہ جل شانہٗ!

منطق کے لحاظ سے ہمارے سامنے یا تو عالم ہے یا جزوِ عالم ہے اور عالم میں عالم ہی کا تصرّف محال، لہٰذا عقلی بات یہ ہے کہ اس عالم کے علاوہ کوئی دوسرا متصرف ہونا چاہیئے اور وہ خدا ہے ــــ مطلب یہ کہ مکان کو مکان نہیں بناتا، دوسرا بناتا ہے۔ گھڑی کو گھڑی نہیں بناتی۔ روٹی کو روٹی نہیں پکاتی۔ آنکھ کو آنکھ نہیں دیکھتی۔ ہمارے ہاتھوں کو ہاتھ نہیں بناتا۔ خود ہم نے اپنے آپ کو نہیں بنایا۔ مکمل انسان کو کسی انسان نے نہیں بنایا ورنہ پیدائشی اندھا۔ کانا لنگڑا۔ لولا۔ بہرا کوئی نہ ہوتا ــ بالکل اسی طرح کل عالم کو عالم نے نہیں بنایا بلکہ اس عالم کا بنانے والا اس کے علاوہ اور ہی کوئی ہے ــــ اور وہ ہے ذاتِ خداوندی!

منطق کے نزدیک اگر یہ دنیا خود بخود ہوتی تو کمالات میں سب برابر ہوتے اور ایک بار ہی ہو جاتے۔ کوئی کسی سے کسی بات میں کم نہ ہوتا۔ حسب دل خواہ ہوتے۔ کیونکہ خود بخود ہونے والا اپنی ذات میں کسی کا محتاج نہیں۔ جو اپنی ذات میں کسی کا محتاج نہیں اُسے اپنی صفات میں بھی کسی کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ صفات ذات کے تابع ہوتی ہیں۔ مگر انسان کھانے پینے پہننے اوڑھنے اور رہنے سونے کا محتاج ہی محتاج ہے۔ اگر وہ کسی کا محتاج نہیں تو اس کو فنا بھی نہ ہونا چاہیئے۔ مگر انسان نہ چاہے، تب بھی کوئی اسکو موت دے دیتا ہے، اور وہ

فنا ہو جاتا ہے جو خود بخود ہو وہ فنا نہیں ہوا کرتا۔ جب وہ کسی کے پیدا کرنے سے پیدا نہیں ہوا تو کوئی اسکو مارنے والا بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن انسان کا فنا ہونا اظہر من الشمس ہے تو ضرور وہ اپنے وجود میں بھی کسی کا محتاج ہے، اور صرف انسان ہی نہیں، ہر شے میں تفاوت ہے۔ روشنی روشنی میں تفاوت۔ گرمی سردی۔ رات دن، صبح وشام۔ قلیل وکثیر۔ مقدار وساخت میں تفاوت۔ اور تفاوت وفرق اس کے احتیاج کی دلیل ہے اور احتیاج والے کے لئے ضرور کوئی حاجت روا ہونا چاہیئے۔ اور سب کی حاجت روائی کرنے والی، خدا اور صرف خدا کی ذات ہے۔

انسان کے کام جو اس کے اپنے اختیار میں دیئے گئے ہیں، وہ بغیر ارادے کے نہیں ہوتے۔ چلنے کا ارادہ کرتا ہے تبھی چلتا ہے۔ ارادہ نہ کرے، نہیں چلتا۔ کھانے کا ارادہ ہو تو کھاتا ہے ارادہ نہ ہو نہیں کھاتا۔ مقصد یہ ہوا کہ ارادہ ہے تو ارادہ کرنے والا بھی ہے۔ یونہی بہت سے کام ایسے ہیں جو کسی انسان بلکہ سارے انسانوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔ ہوا چلانا۔ گرمی، سردی، برسات لانا، زلزلہ پیدا کرنا، اور اسی قسم کے بے شمار کام انسانوں کے بس کے نہیں اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ بغیر ارادہ کیئے کام عمل میں نہیں آتا۔ جہاں انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ امیر ہو جائے، نہیں ہو سکتا۔ چاہتا ہے صحت یاب ہو جائے مگر نہیں ہو سکتا۔ کون انسان مرنا چاہتا ہے۔ مگر انسان کے ارادے اور اختیار کے بغیر موت آجاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان پر ضرور کوئی با اختیار حاکم

موجود ہے جو تصرفات کرتا ہے۔ اور جس کی مرضی اور ارادے کے سبھی تابع ہیں۔ بس یہی بااختیار حاکم خداوند قدوس ہے۔

گردشِ افلاک سے شب و روز بدلنا۔ ہر موسم کا اپنے وقتِ مقررہ پر آنا۔ ماہتاب کا صرف راتوں میں طلوع ہونا۔ انسان کے مادّے کا اوّل اوّل رحمِ مادر میں قطرۂ منی ہونا، پھر اس کا خون بننا۔ خون سے گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہونا۔ پھر جسم بننا اس کا سامع و باصر ہونا۔ پھر رحمِ مادر سے باہر آنا۔ ماں کی خشک چھاتیوں میں دودھ کا آجانا اور بچّے کا چسکی لے کر اس کا دودھ پینا۔ حیوانات کا انسان کے تابع ہونا۔ سارے انسانوں کا مختلف احوال ہونا کہ کوئی سوداگر ہے تو کوئی اہلِ حرفہ ہے۔ کوئی کاشتکار ہے تو کوئی نوکری پیشہ ہے۔ کوئی غنی ہے تو کوئی فقیر ہے۔ کوئی خوش ہے تو کوئی غمگین ہے۔ یہ سب ایک منتظم ہستی کے انتظامات ہیں۔ انتظام کرنے والا نہ ہوتا تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جاتا۔ انتظام ہے تو منتظم بھی ماننا پڑے گا، جس نے بڑی حکمت سے کاروبارِ عالم کو سنبھالا ہوا ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن اپنے پیدا ہونے اور مر جانے میں مجبور و بے بس ہے، بچپن کے گزرنے، جوانی کے ڈھلنے، بڑھاپے کے آنے، بالوں کے سفید ہونے۔ آنکھوں کی بینائی کم ہونے۔ بیمار و تندرست بن جانے۔ فقیر و محتاجی سے چھٹکارا پانے میں مجبورِ محض ہے اور اس قسم کے معاملات میں انسان کے اختیار کا کوئی عمل و دخل نہیں ہے۔ جب ایک اشرف المخلوقات کو اپنے وجود و بقا کا اختیار نہیں تو اور کس کو ہو سکتا

ہے، ماننا پڑے گا کہ اس اشرف المخلوقات کے اُوپر ایک اشرف ترین ذات موجود ہے۔ یہ ذات اس قادرِ مطلق کی ہے جو انسان کے ارادوں، عزائم اور تدابیر توڑ کر اپنی مشیت سے کام لیتا ہے۔

آگ، پانی، مٹی اور ہوا یہ چار کے چار عناصر ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ آگ میں پانی ملاؤ یا پانی میں آگ ڈالو تو بجنسہٖ جمع نہیں ہو سکتے۔ مٹی پانی میں گھل جاتی ہے، ہوا پانی کو دھکیل دیتی ہے۔ آگ بھاپ بنا کر اُڑا دیتی پانی آگ کو بجھا دیتا۔ مگر یہ مختلف تاثیر والے، ایک دوسرے کے جانی دشمن چاروں عناصر انسان میں کس نے یکجا کر دیئے۔ اور اس خوبی سے جمع کئے کہ ایک عنصر بھی کم ہو تو زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ خود بخود ایسی مختلف طبائع کا اکٹھا ہو کر شیر و شکر ہونا محالِ عقلی ہے ــــ یقیناً یہ محیّر العقول کارنامہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے کہ انسان بیک وقت چار مختلف عناصر کا مجموعہ ہے اور چاروں عناصر دشمنی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے دوست اور بہی خواہ بنے ہوئے ہیں۔ ذرا کوئی سائنسدان تو چاروں عناصر کو ایک ساتھ آٹے اور پانی کی طرح گوندھ کر دکھا دے۔

آنکھ کی کمزوری کے باعث اگر کچھ نظر نہ آئے جیسے چمگادڑ کو آفتاب روشن ہونے پر کچھ بھی نظر نہیں آتا، اسی طرح جو چیز زیادہ قریب ہوتی ہے، وہ بھی نظر نہیں آتی۔ آنکھیں اپنی پیشانی رخسار وغیرہ کو خود نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ ان چیزوں کو آنکھوں کا قرب حاصل ہے۔ اسی طرح باری تعالیٰ بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ وہ اگر اس قرب اور

ہماری آنکھوں کی کمزوری کے باعث دکھلائی نہ دیں تو اس میں کون سی بعید از عقل بات ہے؟

منکرین خدا تدبّر اور تفکّر سے کام نہیں لیتے۔ خود تو عقل کی رٹ لگاتے ہیں مگر اپنی عقل کو بروئے کار نہیں لاتے۔ مشاہدے کی ترازو پر ہر چیز کو تولنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ رات دن انسانی مشاہدات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارا مشاھدہ تو ان اندھوں کی طرح ہے جنھوں نے ہاتھی کے جسم کو ٹٹول کر اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق اسکی تعریف کی تھی۔

ایک اندھے کا مشاہدہ تھا کہ وہ پنکھے جیسا ہے۔ کیونکہ اس نے ہاتھی کے کانوں کا مشاھدہ کیا تھا۔ "ٹانگ کو چھونے والا بضد تھا کہ ہاتھی تو ایک ستون کی طرح ہوتا ہے۔ سونڈھ کا مشاہدہ کرنے والا کہتا تھا کہ یہ ایک اژدھے سے ملتا جلتا ہے جب کہ دُم چھونے والے کے نزدیک ہاتھی کی حیثیت رسّی کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں ملتی تھی۔ لہٰذا ہر بات کا دار و مدار اپنے ناقص مشاہدات پر رکھنا بالکل غلط اصول ہے۔

باب ۱۵

اچھے خاصے مسلمان آدمی معلوم ہوتے تھے مگر گفتگو ہوئی تو پتہ چلا کہ خیالات ہی بدلے ہوئے ہیں۔ ہم نے بات چیت کے دوران صرف اتنا کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس دورِ ابتلاء میں بھی اسلام پر چلنے والے کم نہیں ہیں۔ بس جی ایسے جوش میں آگئے کہ اللہ کی پناہ آنکھیں نکال کر غصّے کے ساتھ بولے "کیسا خدا؟ کہاں کا خدا؟ ایک فرضی خدا مان کر سیدھے سادھے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے ڈھکوسلا بنالیا ہے اور ہر بات میں اسی کا نام لے دیا جاتا ہے"۔

ان کی بات سُنکر پہلے تو ہم سناّٹے میں آگئے۔ پھر قدرے ہوش بجا ہوئے تو ہم نے شکی لہجہ میں کہا "لوگوں سے سُنا ہے کہ اس دنیا میں ایک ملک امریکہ ہے۔ ایک روس ہے۔ بڑے شہروں میں لندن ہے۔ ٹوکیو ہے۔ ہمارے خیال میں یہ سب فرضی باتیں ہیں ہم لوگوں کو دوسری اقوام سے مرعوب کرنے کے لئے ڈھکوسلے بنالئے ہیں۔ حقیقت میں نہ امریکہ ہے نہ لندن اور نہ روس ہے اور نہ ہی ٹوکیو"۔

جتنی حیرت ہمیں ان کی بکواس سُن کر ہوئی تھی، اس سے کہیں زیادہ

حیرت انھیں ہماری جہالت اور کم علمی پر ہوئی۔ سنبھل کر بولے "کیوں صاحب آپ ان ممالک اور شہروں کو کیوں نہیں مانتے؟"

ہم نے عرض کیا "عقل کہتی ہے کہ جب انھیں دیکھا ہی نہیں ہے تو کیسے مان لیں؟ سُنی سُنائی باتوں پر یقین کرنا ہرگز ہرگز مناسب نہیں ہے۔"

وہ اسی طرح مسکرائے جیسے ہم ان کے نزدیک دُنیا کے احمق ترین انسان ہیں۔ پھر یوں سمجھانے لگے جیسے کسی ننھے سے بچے کو کوئی مشکل سوال حل کرا رہے ہیں "کیوں جناب! کیا ہر چیز دیکھنے کے بعد ہی تسلیم کی جا سکتی ہے؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان جب تک دُنیا کا ہر خطّہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے، اُسے تسلیم نہ کرے۔ ایک شخص کسی جگہ پہنچا ہے تو دوسرا شخص وہاں نہیں پہنچا۔ مگر وہ پہلے کی بات مان لیتا ہے۔ کسی ملک یا شہر کو ماننے کے لئے خود وہاں جانا اور اُسے دیکھنا ضروری نہیں ہے۔"

ہمیں بھی ان کی بات پر ہنسی آگئی۔ ادب سے کہا "خدا کے متعلق کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو اُس کے پاس لے چلو، ہم آنکھوں سے دیکھ لیں تو تسلیم کر لیں گے۔ ان کا یہ کہنا آپ کے قول کے مطابق کہ خود جانا اور دیکھنا ضروری نہیں ہے، غلط ہوا نا؟"

اب ان کی سمجھ میں آیا کہ باتوں ہی باتوں میں ہم نے ان کی دکھتی رگ پکڑ لی۔ دو منٹ خاموشی کے بعد کہنے لگے "آپ کا اعتراض بالکل بچکانہ ہے کیونکہ آپ چاہیں تو ہم آپ کو امریکہ اور لندن لے جا کر دکھا سکتے ہیں۔"

ہم نے کہا "اچھا اب معلوم ہوا۔ جب تک ہم وہاں نہ پہنچیں اور اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اس وقت تک ہم امریکہ اور لندن کو نہ ماننے میں حق بجانب رہیں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چونکہ وہاں پہنچ کر ان کو کسی نہ کسی وقت دیکھا جا سکتا ہے، اس لئے آج بغیر دیکھے ہی مان لیا جائے۔؟"

بولے "ہاں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ تم کو وہاں پہنچ کر دیدار کرا دیں گے تو ابھی مان لینے میں کیا حرج ہے؟ اصولی طور پر تو مان لینا چاہیئے۔"

ہم نے کہا "مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ جنّت میں چلیں گے تو وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اور وہیں ان کا دیدار ہوگا۔ اگر آپ اپنی دلیل سے اصولی طور پر کچھ تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو اُسی دلیل سے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیجئے۔"

"میاں۔ ہم تو تمھیں کچھ پڑھا لکھا، ذہین اور سمجھدار شخص سمجھتے تھے لیکن تم تو بالکل ہی عقل سے پیدل ہو۔"

وہ منہ بنا کر بولے "امریکہ ہو یا لندن، روس ہو یا ٹوکیو۔ ان سب کے وجود کے اتنے لوگ قائل ہیں کہ ان کا شمار ہی نہیں۔ اخبارات، رسالے، ریڈیو گواہ ہیں۔ ہر جگہ ہر وقت ان کا ذکر زبان پر ہے۔ جو لوگ وہاں ہو کر آئے ہیں، وہ شہادت دیتے ہیں۔ بھلا جس بات کے اتنے کہنے والے ہوں، وہ غلط ہو سکتی ہے؟"

ہم نے کہا "جناب۔ خدا کو بھی ماننے اور تسلیم کرنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اس نئی دنیا کی دریافت سے پہلے ہی خدا کے

ماننے والے چلے آرہے ہیں۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے دیکھئے، تب بھی خدا کے ماننے والے، نہ ماننے والوں سے بہت زیادہ ہیں۔ خدا کا ذکر اخبارات میں، ریڈیو میں۔ لوگوں کی زبانوں پر جاری و ساری ہے۔ بھلا پھر کس منہ سے اس کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ انبیاء علیہم السلام جو پاکباز سچے۔ باعفت و عصمت صادق و مصدوق انسان ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس خدا سے باتیں کی ہیں اور ببانگ دُہل انھوں نے اُسے دیکھنے کا اعلان کیا ہے۔ پھر ان تمام دلائل کے ہوتے ہوئے آپ کا امریکہ کے وجود کو ماننا درست لیکن اسی دلیل سے بلکہ اس سے بڑھ کر دلیل سے خدا کو ماننا غلط۔ ایں چہ بوالعجبی است۔ کیا یہ آپ کی ہٹ دھرمی نہیں؟"

ہم دو تین منٹ کے لئے خاموش ہو گئے، کہ شاید وہ ہماری بات کا کوئی جواب دیں مگر ان کے چہرے کا رنگ فق تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسلسل خلا کو تکے جا رہے تھے

چند لمحوں کے انتظار کے بعد ہم نے پھر کہا۔" آپ مکہ معظمہ میں خانہ کعبہ جاکر دیکھیں کہ کتنے ممالک کے افراد وہاں اکٹھا ہوتے ہیں۔ کسی کی بولی کچھ ہے۔ کسی کی کچھ ہے۔ کسی کا قد و قامت جداگانہ ہے تو کسی کا رنگ۔ شکل و صورت ایک سی نہیں۔ بود و باش الگ الگ ہے۔ ایک دوسرے کی زبان سے واقف نہیں۔ مگر اس گھر کی طرف جو خدا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور جہاں ہمہ وقت انوار الٰہی نازل ہوتے ہیں، کھنچے چلے جاتے ہیں۔ کس طرح محبت اور پیار کے ساتھ اللہ کا نام لیتے ہیں۔ اُس سے مرادیں مانگتے ہیں۔ گناہوں

کی معافی چاہتے ہیں۔ ان میں تاجر، پیشہ ور، کاشتکار، فوجی، افسر، حاکم، بادشاہ، مزدور، امیر اور غریب ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ مگر ایک بات پر سبھی متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور ہمیں اُسے راضی کرنا ہے۔ جس کو دیکھو، ایک ہی دُھن اور ایک ہی دھیان ہے کہ اللہ کو کیسے راضی کیا جائے ۔ کیا اس کے سب مختلف ممالک کے انسان جھوٹ کہتے ہیں اگر امریکہ و لندن کے وجود کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ اتنے انسان اس کے وجود کے قائل ہیں کہ ان کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، بلکہ اتنی زبانوں سے بار بار سُن کر یقین آجاتا ہے اور بغیر گئے اور بغیر دیکھے ہوئے ماننا پڑتا ہے، پھر خدا تعالیٰ کے وجود کے لئے بھی یہ دلیل کافی ہے کہ جس ہستی کے وجود کے قائل اتنے انسان ہیں، ان کی تکذیب کرنا عقلِ سلیم کے خلاف ہے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور یقینِ کامل کے ساتھ اُسے مان لیا جائے"۔

ہمارا خیال تھا کہ اب وہ خاموش نہ رہ سکیں گے لیکن ہوا یہ کہ وہ اچانک اُٹھے اور سلام دُعا کے بغیر چرمی تھیلا اُٹھا کر یہ جا، وہ جا۔ بڑی دیر تک ہم حیران، پریشان بیٹھے رہے کہ آخر انھیں کیا ہو گیا؟ ہم نے کوئی ایسی بات تو کہی نہیں جس سے ان کی شان میں کچھ گستاخی ہوئی ہو۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اُٹھ کر اپنے کام کاج میں لگ گئے۔

رات کو عشاء کے بعد ہمیں ایک دوست کے ذریعہ ان کا ایک مختصر سا خط ملا۔ لکھا تھا۔ "بیشک، میرا خیال غلط تھا۔ میں دل سے معافی چاہتا ہوں اور تائب ہوتا ہوں۔

الحمد اللہ۔ میں مسلمان ہوں مگر غلط لوگوں میں بیٹھ جانے کی وجہ سے میرے خیالات میں فرق آ گیا تھا۔ آپ کی باتوں سے میری آنکھیں کھل گئیں ہیں اور میں سمجھ گیا ہوں کہ جس بات کے ابتدائے آفرینش سے اب تک لاکھوں کروڑوں انسان ہر زمانے میں قائل چلے آرہے ہیں اور ان انسانوں میں بڑے بڑے عقلمند بھی ہیں، اس بات کو جھٹلانا ناممکن اور اتنے آدمیوں کو بے وقوف سمجھنے کے مترادف ہے۔ میں اپنی کم عقلی کا اعتراف کر کے اپنی ہی دلیل سے اللہ کے وجود کا قائل ہوتا ہوں۔ وللہ الحمد"۔

باب ۱۶

دراصل دنیا میں اعتماد و بھروسہ کئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔ اگر اعتماد ہو، کام درست ہوتا ہے۔ اعتماد ختم ہو جائے تو جما جمایا کاروبار بھی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بیوی کو میاں پر اور میاں کو بیوی پر اعتماد ہوتا ہے تو گھر بنتا ہے۔ اعتماد اُٹھ جائے تو گھر کی تباہی و بربادی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ملازم پر اعتماد ہو تو بڑے بڑے کام اُس کے سپرد کر دیتے ہیں ــــ اعتماد نہ ہو تو کان پکڑ کر نکال باہر کرتے ہیں۔ ملازمین کو آقا پر اعتماد ہوتا ہے کہ یہ تنخواہ پوری دیگا تو مہینے بھر دیانت و امانت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اعتماد نہ رہے تو کوئی کام نہ کرے۔ حکومتیں اپنے حکام، افسران اور افواج کے اعتماد پر ہی چلتی ہیں۔ عدالت میں حاکم موقعۂ واردات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا بلکہ سچے اور ایماندار گواہوں کی شہادت پر اعتماد کر کے پھانسی کی سزا دیتا ہے۔ اگر شہادت کا اعتماد نہ رہے تو مقدمات کا فیصلہ ناممکن ہو جائے۔ شہادت و گواہی دراصل شاہدوں اور گواہوں کے قول کا نام ہے اور ان کے قول پر اعتماد کر کے ہی کسی حتمی فیصلہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔

الغرض دنیا کے سبھی کام اعتماد کر لینے ہی سے چلتے ہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو زندگی دو بھر ہو جائے۔ کسی شخص کو نہ بیوی پر اعتماد ہو، نہ بچوں پر، نہ ملازم پر اعتماد ہو، نہ اپنے افسر پر، نہ دوست پر اعتماد ہو، نہ کسی عزیز پر تو اس کے کام نہیں چل سکتے۔ حیرانی و پریشانی کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ لازمی اعتماد کرنا پڑے گا۔ کام کا دار و مدار ہی اعتماد پر ہے۔ اور آدمی جتنا صادق القول اور امانت دار ہوتا ہے، اتنا ہی اس کا کام وسیع ہو جاتا ہے۔ بینک کے مینجر کو محض اعتماد ہی کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں روپیہ سونپ دیا جاتا ہے کیونکہ اُسے سچّا، ایماندار اور دیانت دار سمجھ لیا گیا ہے۔

جب یہ بات اپنی جگہ پر اٹل اور مسلّم ہے اور اس میں اختلاف کی رتّی برابر گنجائش نہیں ہے، تو اب آپ اس حقیقت کو بھی سمجھئے:۔

"جناب رسولِ کریم حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صادق القول اور امانت دار انسان جو ہر خوبی اور ہر اخلاق میں کامل و مکمل ہو، اس دنیا میں نہ پیدا ہوا اور نہ ہو گا۔ جو لوگ تاریخ کے کیڑے ہیں، وہ ساری تاریخ پڑھ جائیں اور بتائیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری زندگی کسی ایک لمحے، ایک سیکنڈ، ایک ساعت میں کبھی بھی کوئی غلط بات دانستہ یا نادانستہ طور پر کہی ہو۔ خوب اچھی طرح سے آزمالو۔ خوب پرکھ لو۔ تواریخ چھان ڈالو۔ اہلِ کتاب سے معلومات کرو۔ خاندان والوں سے پوچھو۔ دشمنوں کی شہادت دیکھو اور پوری پوری تحقیق کرنے کے بعد بتاؤ کہ کبھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی نے یہ تہمت لگائی کہ وہ حق کے خلاف کہتے ہیں

دُنیا کے کونے کونے کو کھنگال لو۔ دنیا بھر کے کتب خانوں میں جا کر خوب تفتیش و کرید کرو۔ انشاءاللہ آپ کو ایک لفظ بھی غیر حق کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا نظر نہ آئے گا۔ دشمن جان بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق و امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ایسے دشمن جو عمر بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بر سرِ پیکار رہے اور دشمنی پر اپنا مال گنوایا، عزّت کھوئی۔ اولاد کو یتیم اور بیوی کو بیوہ کیا، مگر وہ بھی اپنی زبان پر ایک حرف یہ نہ لا سکے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں بات جھوٹ تھی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ ساتھیوں کو طرح طرح کی جانکاہ اذیّتیں دی گئیں۔ مگر حضورِ اقدس کی زبانِ مبارک سے کلمۂ حق ہی نکلتا رہا۔۔۔ پتھراؤ ہو رہا ہے۔ مقدّس پنڈلیاں لہو لہان ہیں۔ اُونٹ کا بوجھ پشت مبارک پر ڈالا جا رہا ہے۔ ننگی تلواروں سے گھر کا محاصرہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ غار میں چھپے ہوئے ہیں۔ اپنے خاندان تک کے لوگ دشمن ہو گئے ہیں۔ شعب ابی طالب میں بائیکاٹ کے تین سال محصور رہ کر گزار چکے ہیں۔ قتل کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ حسین سی حسین عورت کی پیشکش کی جا رہی ہے۔ تمام ملک کی سرداری کا لالچ دیا جا رہا ہے۔ دولت کے انبار حاضر ہیں۔ مگر حق و صداقت کے علمبردار اور صدق و صفا کے پیکرِ اعظم سے صدق و امانت کے علاوہ رائی برابر بھی لغزش نہیں ہوتی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی قدم نہیں ڈگمگائے۔

جنگ کا میدان ہے۔ بالمقابل دشمن جرّار ہے۔ حکومت کی باگ، دوڑ ہے۔ ہزاروں لاکھوں جانثار ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے قدموں میں ہیں پھر بھی وہی قولِ حق زبانِ مبارک پر ہے۔ گھر میں دیکھو، ایک ایک ماہ سے چولہے میں آگ نہیں جلتی دوسروں کے شکم پر بھوک کے باعث ایک پتھر ہے تو شکمِ مبارک پر دو پتھر بندھے ہیں کُرتے میں پیوند لگے ہیں۔ لیکن صدق و امانت ہر حال میں زیبِ زبان و کلام ہے۔ ایک کے سامنے بھی وہی صفات ہیں اور لاکھ کے مجمع میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صفاتِ کمالیہ کے مظہر ہیں۔ کہیں کوئی کمزوری، کوئی لغزش، کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

ماضی کی تاریخ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے سے لیکر اپنی بعثت تک ساری باتیں بیان فرمائیں۔ کسی اہلِ علم، کسی اہلِ کتاب، کسی مؤرخ نے پیش کردہ تاریخ میں غلطیات کا ایک شوشہ تک نہ نکالا بلکہ یہ تسلیم کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غلط تاریخ کو صحیح کیا۔ اس تاریخ کو امیّوں نے بھی مانا اور اہل کتاب نے بھی تصدیق کی۔ اور جب حضور پُر نور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مستقبل کے بارے میں پیشگوئیاں فرمائیں تو آج تک ایک حرف بھی اس کے خلاف نہ ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اس وقت تک کسی نے بھی ماضی و مستقبل کی ایسی تاریخ پیش کی، جس کی حق و صداقت کی گواہی مخالفین اور دشمن بھی دیتے ہوں؟ پیشگوئیاں پڑھ کر دیکھو اور کھوج لگاؤ کہ جتنی پیشگوئیاں پوری ہو چکی ہیں، ان میں کوئی فرق ہے؟

یقیناً یہی کہو گے کہ سرِ مو بھی فرق نہیں۔ جب جنگِ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل فلاں فلاں جگہ فلاں فلاں کا قتل ہوگا، تو کیا دوسرے دن اُس میں کچھ فرق نکلا؟ جب یہ کہا تھا کہ قیصر و کسریٰ کے تخت تمھارے قدموں کے نیچے ہوں گے، اس وقت کس کو خیال آسکتا تھا کہ اونٹ چرانے والے لوگ ان کو فتح کرلیں گے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ جو فرمادیا، وہ پورا ہوا۔ زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات پتھر کی لکیر ثابت ہوئی کیا کسرایٰ کے کنگرے نہیں گرے؟ سراقہ رضی عنہ اللہ نے کسرایٰ کے کنگن نہیں پہنے؟ تیس سال تک خلافتِ راشدہ نہیں رہی؟ لفظ قرنی سے چاروں خلفائے راشدین کے اسماء کے آخری حروف کی طرف اشارہ کرکے خلافت کی نام بنام ترتیب نہیں بنادی؟ شراب، زنا، گانا، اور باجے عام نہیں ہوا؟ جو فرمایا وہ سامنے آتا جارہا ہے۔ اسی لئے ہم یقینِ کامل سے کہتے ہیں اور بڑے پکے اعتماد اور اعتقاد اور بھروسے کے ساتھ کہتے ہیں کہ نبی آخرالزّماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا۔ بالکل حق فرمایا۔ جو ساری عمر اپنے نفس کے لئے جھوٹ نہ بولے ہوں، بھلا وہ خدا کے متعلق کوئی جھوٹ بات کہہ سکتے ہیں؟

اعتماد کے بغیر یہاں بھی کام نہیں چلے گا۔ اعتماد کرو اور بحیثیت مسلمان کے اعتماد کرنا ہی چاہیئے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد ہے اور ہم مسلمان ہیں تو یقیناً اعتماد ہے تو اب عقل کو پیچھے رکھو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کی تصدیق کرو۔ جو بات ارشاد فرمائیں، مانتے چلے جاؤ۔ کیونکہ وہ صادق القول امانت والے، دیانت والے ایسے صاحب کمال ہیں کہ ان

پر سارے انسانی کمالات ختم ہیں ۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ ۔

وہ فرماتے ہیں "خدا ایک ہے ۔ وہ موجود ہے ۔ لاشریک ہے ۔ نہ اُس نے کسی کو جنا اور نہ اُسے جنا گیا "۔

ہم کہتے ہیں "اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "۔

وہ فرماتے ہیں "میں خدا کا رسول ہوں "۔

ہم کہتے ہیں "حق ہے ۔ اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہ "۔

وہ فرماتے ہیں "قرآن خدا کی کتاب ہے جو مجھ پر نازل ہوئی "۔

ہم کہتے ہیں "ہمارے ماں باپ ۔ ہماری جان و مال ۔ ہمارے بیوی بچے اور ہم خود آپ پر قربان ہو جائیں یا رسول اللہ ۔ آپ بالکل صحیح ارشاد فرماتے ہیں ۔ بیشک قرآن اللہ کی کتاب ہے جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور اس میں جو کچھ لکھا ہے ۔ سب برحق ہے "۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں بتاتے ہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ قبر کا عذاب و ثواب ۔ آخرت، قیامت، حساب و کتاب ۔ پل صراط ۔ جنت دوزخ ۔ اور جو کچھ وہ ارشاد فرماتے ہیں ، اس کو ہم کامل اعتماد و اعتقاد کے ساتھ دل سے مانتے ہیں اور زبان سے اقرار کرتے ہیں ۔ اور شہادت دیتے ہیں کہ جو احکامات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کے لئے لائے ، ہم نے وہ سب ایک ایک قبول کئے ۔ خواہ کوئی بات ہماری ناچیز عقل میں آئے یا نہ آئے ، ہم سب پر ایمان لائے ۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۔

باب ۱

تسنیم میاں یہ بات تو سوچ کر بتاؤ کہ جب کوئی گھر آباد ہوتا ہے اس میں چڑیاں چہل پہل رکھتی ہیں اور غیر آباد مکان سے رفو چکر ہو جاتی ہیں اس کے برخلاف اُلّو ویرانے میں رہنا پسند کرتا جہاں آبادی ہوئی اور وہ بھاگا۔ اور جہاں کہیں ویرانہ دیکھے گا وہاں جاکر ڈیرہ لگائے گا۔ جیسا کہ آباد گھر سے اُسے سخت نفرت ہے آخر یہ کیا بات ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ آپ تو ہر شے کی لم نکال لیتے ہو۔ کہنے لگے کہ ان چڑیوں اور اُلّو کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ چڑیں بساست مانگتی ہیں اور اُلّو ویرانہ۔ یہ بات آپ کی صحیح ہے کہ ان کی یہ طبعی بات ہے مگر میں پوچھوں گا کہ آخر وہ کون ہے جس نے ان کی متضاد طبیعت بنائی اور ہر ایک میں الگ الگ مزاج پیدا کیا۔ آخر ان کی فطرت اور طبیعت کو پیدا کرنے والا اُن کو اس طرح بنانے والا کون ہے۔ غور کر کے جواب دو۔

فہیم: میاں کہنے پڑے گا کہ ان کے پیدا کرنے والے نے ان کو ایسا ہی پیدا کیا ہے۔ اور ہر ایک ساخت کے اختلاف کی طرح ان کے مزاج اور فطرت بھی مختلف پیدا کی ہیں۔ بہر حال ان کا پیدا کرنے والا اور طبیعت کا بنانے والا

ضرور ہے اور اس ہستی کو ہم خدائے تعالیٰ کہتے ہیں۔

اور یہ صرف چڑیا اور اُلّو پر کیا موقوف ہے یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہر جانور میں اسکی خاص طبیعت ودلیعت کر دی ہے جو اگر فہم سے کام لیں تو صاف ظاہر ہوتی ہے۔ بنانے والے نے جیسا بنا دیا وہ اسی طرح چلتا ہے۔ جس طرح اُسے بنایا ہے۔ یہ صاف دلیل ہے کہ ہر شے کا ایک بنانے والا ضرور ہے۔

دیکھو بلی کو گھر سے محبّت ہوتی ہے۔ سو گھر والے اگر گھر چھوڑ جائیں تو بلّی اُس گھر کو نہیں چھوڑتی۔ اور کُتّا مالک کے ساتھ رہتا ہے جب تک مالک وہاں ہے کُتّا بھی رہے گا مالک گیا کُتّا بھی چلا جائے گا۔ اچھّا اور دیکھو چڑیا کا بچہ جب گر پڑتا ہے اور کمزور ہوتا ہے تو چڑیا اُس کے پاس آ کر شور کرتی ہے پھر جو چڑیا اسکی آواز سنتی ہے آموجود ہوتی ہے اور سب شور کرتی ہیں اور اس بچّے کے گرد تھوڑا تھوڑا اُڑتی ہیں اس طرح اُسے حرکت میں لاتی ہیں اور اس میں حرارت دیکر اس میں قوت پیدا کرتی ہیں یہاں تک کہ وہ بچّہ ان کے ساتھ اُڑنے لگتا ہے۔ یہ سوچو ان ننھّے ننھّے پرندوں میں یہ سمجھ کس نے پیدا کی ہے ہے کوئی یا نہیں؟

تم صرف ان پرندوں ہی میں غور کر لو تو خدا کی قدرت اور اس کی وحدانیت سامنے آجائے گی۔ کبوتری پہلی بار حاملہ ہوتی ہے۔ اور جہاں وہ باردار ہوئی تو کبوتر اور کبوتری دونوں کو گھونسلہ بنانے کی فکر از خود ہو جاتی ہے کہ اب انڈا رکھنے کی جگہ بنائیں اس لئے دونوں تنکے لا لاکر گھونسلہ تیار کرنے میں لگ جاتے ہیں اور محفوظ گونسلہ تیار کر لیتے ہیں وہ تنکے اس طرح رکھتے ہیں کہ جس سے آرام دہ گھونسلہ بن جاتا ہے جب انڈا نکل آتا ہے تو کبوتری اُسے سیتی

اور پیروں کی گرمی پہنچاتی ہے۔ اور چند دنوں کے بعد ان انڈوں کا رُخ بدلتی ہے اور یہ کام مادّہ کرتی ہے جیسا کہ ماں بچےّ کو پرورش کرتی ہے۔ پھر جب بچہّ نکل آیا تو اُسے چوگہ دینے کا کام نر کے ذمہ ہوتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ انڈے سے باہر آتے ہی بچےّ کا معدہ خوراک ہضم کرنے کے قابل نہیں ہے تو اُس کے حلق میں اپنے حلق سے پھونک دیتے ہیں تاکہ پوٹا پھول جائے اور اس میں وسعت ہو جائے۔ پھر ایسا چوگہ دیتے ہیں جس سے غذا کے ہضم کی طاقت آ جائے یعنی دیوار پر جو نمک جما رہتا ہے وہ کھلاتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا پوٹا مضبوط ہو گیا تب دانے کا چوگہ دیتے ہیں پھر جب وہ زمین سے اُٹھا کر کھانے لگتا ہے تو چوگہ دینے سے گریز کرنے اور اُسے مارتے ہیں کہ خود کھا پھر وہ خود کفیل ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے انڈے دینے کی فکر لگ جاتی ہے۔ نر کی طرف سے بلانے کی ابتداء ہوتی ہے۔ مادہ دیر لگاتی ہے بلانے کی خواہش پیدا ہوتی۔ مادّہ طرح طرح سے پہلو بدلتی ہے پھر محبت کرتی ہے دونوں میں عشق بازی شروع ہو جاتی ہے اور سب باتیں بھاتی ہیں۔ اور سب میں یہی بات آپ پائیں گے آخر کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ کوئی رب العالمین نہیں ہے جب ربوبیت موجود ہے تو رب کا کیسے انکار ہو سکتا ہے ربوبیت ہے تو رب بھی ضرور ہے جو انکار کرتے ہیں وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ بے فکرے ہیں۔

تسنیم میاں غور تو کرو۔ یہ مکڑی اسکی کیا حقیقت ہے سب گھروں میں سب سے بودا گھر اس مکڑی کا ہے کہ تاروں کا بنا ہوا ہے مگر مکھی کے شکار

کرنے کے لئے بہتر بن جال ہے مکھی اس میں پھنسی اور مکڑی نے شکار کیا بعض دفعہ سانس روک کر اس طرح چپک جاتی ہے کہ گویا موجود ہی نہیں ہے مگر مکھی اِس سے غافل ہو کر آئی اور اُس نے حملہ کیا اور تاروں پر چیکر ہی وہ شکار کرتی ہے اور اُسے ہر طرف گھومنا اور دیکھنا پڑتا ہے اسلئے قدرت نے اس کے جسم کے اندر کئی کئی آنکھیں بنا دی ہیں۔ جس طرف جانا چاہے اس طرف آنکھ موجود ہے۔ اور اسکی خوراک بھی مچھر مکھی بنائی۔ اور ویسا ہی سامان اس کے لئے مہیا کر دیا یہ سب کچھ مانتے ہو مگر اُس کے بنانے والے کا انکار کرتے ہو، ایسی عقل پر رونا چاہیئے۔

غور کرو، لومڑی کو جب غذا کی دشواری آتی ہے تو اپنے آپ کو مردہ کی طرح کر لیتی ہے اور پیٹ پھلا لیتی ہے۔ پرندہ اُسے مردہ سمجھ کر آپڑتا ہے تو ہضم کر لیتی ہے۔

چیونٹے اور چیونٹیاں گرمی کے موسم میں سردی کے لئے ذخیرہ جمع کرنے لگتے ہیں پھر جن دانوں کے سڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے ان کو باہر نکال کر دھوپ میں ڈالتے ہیں یا چاندنی راتوں میں یہ کام کرتے ہیں پھر اگر بل میں نمی ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ یہ دانہ پھوٹ کر ہمارے کام کا نہ رہے گا تو اکثر اس کے دو ٹکڑے کر دیتی ہیں اور جہاں سے روئیدگی ہوتی ہے اس حصے کو توڑ دیتی ہیں چونکہ دھنیے کا بیج کئی جگہ سے پھوٹتا ہے تو اس کے چار ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ اس میں سونگھنے کی قوت بہت زیادہ ہے۔ جب دانہ بڑا ہوتا ہے تو واپس بل میں جاتی ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں چیونٹیوں کی قطار لگ جاتی ہے۔ پھر ان کی امداد سے

اُٹھا لے جاتی ہیں پھر جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو وہ ضرور رُک کر پھر آگے جاتی ہے
تسنیم ان میں یہ ذہانت اور ذکاوت رکھنے والی کوئی ذات نہیں ہے۔ کیا خود بخود یہ بات ان کے اندر پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک پیدا کرنے والا نہ ہو یہ ذہانت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔

اچھا یہاں ایک تجربہ کی بات بتاؤں کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے کھانے کی چیز میں چیونٹیاں نہ آئیں تو آپ ایسا کریں کہ اس کے اوپر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہاتھ لے جائیں اور زبان سے یہ کہتے رہیں یارسول القاضی یا غلام القاضی تین بار کریں انشاء اللہ پھر چیونٹیاں اس برتن پر نہ چڑھیں گی۔

سوچتے جاؤ اچھا گائے کے دودھ کی دو شیشیاں بھر لو ان میں دو اوقیہ خرگوش کا دماغ ملا کر جسے پلا دو گے اسکی مونچھیں کبھی سفید نہ ہونگی کہ اس کے بال سفید ہو جائیں۔

اچھا دو دانق کافور لو اُسے ایک دانق خرگوش کے دماغ میں ڈالو اور جسکو پلا دو گے ہر ایک اس سے محبت کرنے لگے گا حتیٰ کہ اُسے جو عورت دیکھے گی وہ اس پر عاشق ہو جائے گی۔

اچھا اُونٹ کی ہنڈلی کا گھی لے کر کسی کپڑے میں یا روئی میں لے لو اور عورت غسل حیض کے بعد تین روز اپنے پاس رکھے اس سے اس کا خاوند جماع کرے تو وہ حاملہ ہو جائے گی چاہے بانجھ ہی کیوں نہ ہو۔

حصّۂ دُوّم

خُدا ایک ہے

(٠) اس سے قبل ثابت ہو چکا ہے کہ بیشک خدا موجود ہے۔ جب یہ مان لیا جائے تو اب یہ بھی ماننے کی بات ہے کہ خداوند تعالیٰ میں خدا ہونے کی حیثیت سے جو تمام صفات ہونی چاہییں وہ سب کی سب اس میں اکمل درجہ کی ہیں۔ جس طرح وہ کامل الذات ہے۔ اسی طرح وہ کامل الصفات ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا وہی ہو سکتا ہے۔ جو ہر قسم کے عیب اور نقص اور کمزوری سے پاک و مبرّا ہو۔ ورنہ خالق اور مخلوق میں کیا فرق رہ جائے گا۔ بندے اس لئے خدا نہیں بن سکتے ہیں کہ ان میں طرح طرح کے نقص موجود ہیں۔ مثلاً وجود انسانی ناقص ہے۔ فنا ہو جائے گا۔ قدرت و اختیار بھی ناقص کہ بہت سے کام نہیں کر سکتا۔ علم بھی ناقص کہ بہت سی باتیں معلوم ہی نہیں۔ اس لئے اگر خدا تعالیٰ میں بھی (معاذ اللہ) نقص کی صفت مان لی جائے تو اس کو ہم پر خدا بننے کا کیا حق ہے؟ پس معلوم ہوا کہ خدا وہی ہوگا جس میں کوئی نقص کوئی کمی کوئی عیب نہ ہو جو اپنی تمام صفاتِ کمالیہ سے متصف اور مخلوقات کی صفات سے منزہ اور پاک ہو۔

چنانچہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایسا کامل الذات والصفات خدا تو صرف

ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دو نہیں ہو سکتے۔ اور اگر دلیل سے دو خداؤں کا ہونا باطل ہو جائے تو تین اور دس بیس ہزار خدا تو خود بخود باطل ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہم دو خدا فرض کریں گے ورنہ خدا صرف ایک اور صرف ایک ہے وہ واحد و اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں یعنی کسی بھی حیثیت سے کوئی اس کا بھائی وال شریک اور ساجھی نہیں ہے۔

لیجئے دو خدا فرض کر لئے یہ بھی مان لیا کہ ان میں اتحاد و اتفاق ہے اس کے باوجود دونوں میں مخالفت ممکن ہے کیونکہ جسے مخالفت کی قدرت نہیں وہ قادر نہیں، جو قادر نہیں وہ خدا نہیں ـــــــ اس لئے مخالفت کا امکان ماننا پڑے گا۔ جب یہ امکان مان لیا تو ہو سکتا ہے کہ ایک خدا زید کو مارنا چاہے اور دوسرا خدا اس کو مارنا پسند نہ کرے ایسی صورت میں زید کی یا تو موت واقع ہو جائے گی یا اس کی زندگی باقی رہے گی۔ ایک ہی وقت میں موت بھی ہو اور زندگی بھی ہو، قطعی طور پر محال ہے۔ چنانچہ اگر زید مر گیا تو جس خدا نے اُسے زندہ رکھنا چاہا تھا، وہ عاجز ہو گیا اور خدا نہ رہا ـــــــ اور اگر زید زندہ رہا تو موت دینے والا عاجز ٹھہرا۔ ہر حال میں ایک عاجز ہو گا ـــــــ اور جو عاجز ہو وہ ہرگز ہرگز خدا نہیں ہو سکتا، خدا تو ایک ہی رہا جو قادرِ مطلق ہے۔

سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ اس کائنات پر کامل قبضہ ایک ہی کا ہو سکتا ہے اگر دو کا قبضہ مان لیا جائے تو اس عالم کے بھی دو ٹکڑے کرنے ہوں گے کہ ایک ٹکڑے پر ایک خدا کی حکومت ہو اور دوسرے پر دوسرے کی

مگر سوال یہ ہے کہ ایک خدا دوسرے کے حصّے میں کوئی تصرّف کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کر سکتا تو عاجز ہوا۔ اگر یہ کہو کہ ہاں تصرّف اور قبضہ کر سکتا ہے تو خود بخود ذہن میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ دوسرا خدا اس کو روک سکتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں روک سکتا تو عاجز ہوا اور اگر پہلے کی کوشش کے باوجود اس کو روک سکتا ہے تو پہلا خدا عاجز ہو گیا کہ دوسرے کی اجازت کے بغیر کوئی تصرّف نہیں کر سکتا ــــــ چنانچہ دو خدا ماننے میں ایک کا عاجز ہونا لازم ہے۔ جب کہ عاجز ہونے والا خدا نہیں بن سکتا اس لیے خدا تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

غور کرو کہ خدا دو ہوتے تو نظام کائنات برقرار رہ سکتا تھا؟ سب کچھ ہی درہم برہم ہو جاتا۔ دونوں خدا، خدا ہونے کی حیثیت سے کامل قدرت والے ہوتے اور جب ان دونوں کی قدرت کاملہ کسی ایک مخلوق پر پڑتی تو وہ ٹوٹ جاتی۔ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک سانچے میں دو چیزیں۔ ایک نیام میں دو تلواریں، سیر بھر کے برتن میں دو سیر کی چیزیں، ایک جوتے میں دو قدم اور ایک کوٹ میں دو بدن، ایک جگہ میں اسکی مقدار سے دوگنا سامان نہیں سما سکتا۔ اگر زبردستی کر کے پھنسا دیا جائے تو وہ سانچہ، وہ برتن، وہ نیام ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اس طرح اگر دو خداؤں کی طرف سے ایک مخلوق میں پورا پورا زور لگے گا تو وہ مخلوق نیست و نابود ہو جائے گی۔ اگر کہو کہ اتفاق کر کے کام کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ مخالفت پر قدرت ہے یا نہیں اور ایک دوسرے کی مخالفت کو روک سکتے ہیں یا نہیں۔ نہیں روک سکتے تو عاجز، روک سکیں تو عاجز، ہر حال میں ایک کا عجز ظاہر ہے ــــــ اور اگر یوں کہا جائے

کہ ایک خدا کام کرتا ہے۔ دوسرا کچھ نہیں کرتا تو دوسرا بیکار ہوا۔ فضول و بیکار بھی خدا نہیں ہو سکتا ـــــــ اس لئے خدا تو صرف ایک ہی ہوا۔

کچھ لوگوں کا نیکی کا خدا الگ ہے اور بدی کا خدا الگ، ایک نیکی کا حکم دیتا ہے تو دوسرا بدی کا، ایسی صورت میں لڑائی جھگڑا لازمی ہے۔ ایک خدا نیکی کو کہے گا تو دوسرا بدی کی طرف مائل کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو انسان ختم ہو جائے گا یا دونوں خداؤں میں سر پھٹول ہو جائے گی۔ اور اگر دونوں خدا آپس میں انسانوں کو برابر بانٹ لیں تو آدھی دنیا بد ہونی چاہیئے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ انسان ایک ہی وقت میں نیک و بد دونوں کام کرے مثلاً نیکی کا خدا اُسے مسجد میں دیکھنا چاہے اور بدی کا خدا سینما ہال میں ـــــــ اور انسان بیچارہ بیک وقت دونوں جگہ موجود ہو جائے، اسی طرح یہاں پر قدرت کی مثال بھی صادق آتی ہے بدی والا خدا انسان کو نیکی سے روک کر بدی پر مائل کر سکتا ہے یا نہیں اگر مائل کر سکتا ہے تو وہ خود عاجز ہے ـــــــ اس سے بھی ظاہر ہوا کہ خالقِ خیر اور خالقِ شر ایک ہی ہے۔

اچھا اگر دو خدا مان بھی لئے جائیں تو پھر دروازہ ہی کھل جائے گا۔ پھر تو ہزار اور لاکھ خدا بھی مان سکتے ہیں۔ جو نقص دلیل دو کی ہوگی وہی لاکھ کی بھی ہو سکتی ہے، ایک عابد بیچارہ لاکھ معبودوں کی عبادت تمام زندگی بھی نہ کر سکے گا۔ کس کس کو راضی کرے گا ایک ہی ٹھیک ہے۔

کتا ہو دَر دَر پھرے دُر دُر دَر دَر ہوئے
ایک در کا ہو رہے تو دُر دُر کرے نہ کوئی

خدا وہ ہے جو کامل طور سے مالک ہو کیونکہ

منطق سے دلیلِ وحدانیّت ناقص ملکیّت کا مالک خدا نہیں ہو سکتا

ماننا پڑے گا کہ وہ کامل طور پر مالک ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ایک ہی کامل مالک ہے اور وہی خدا ہے۔

دوسری دلیل ایک ہی ملکیّت کے جیسے یہ عالم ہے۔ دو دعویدار ہوں تو ان میں مخالفت ہو گی۔ مخالفت کا دفاع کرنا ضروری ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ایک ہی کو خدا مانا جائے۔ ہم نے تو دو برتنوں کو آپس میں ٹکرانے کے بعد پھوٹتے ہی دیکھا ہے عافیت و سلامتی تو ایک کو تسلیم کرنے میں ہے۔

خدا کا کوئی بیٹا نہیں جس طرح دو خدا نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح خدا کا بیٹا بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ توالد تناسل کے لئے بیوی کی ضرورت ہو گی اور جس طرح اولاد پیدا ہونے میں ماں باپ کی محتاج ہے۔ اسی طرح ماں باپ اولاد کی خاطر محتاج ہوں گے یعنی اولاد سے ماں باپ خدمت گزاری یا نسل و نام چاہیں گے۔ یہ بھی ایک قسم کی محتاجی ہے اور محتاج خدا ہو نہیں سکتا تو احتیاج کی بات یعنی اولاد کا نہ ہونا اس کے لئے نہیں مانا جا سکتا۔

پھر بیٹا یا تو باپ کا ہم جنس ہو گا یا غیر جنس، اگر وہ بیٹا خدا کا ہم جنس ہے تو توحید باقی نہ رہی، خاک میں مل گئی جب کہ خدا کی وحدانیت کو عقل تسلیم کر چکی ہے۔ اور اگر وہ بیٹا خدا کا ہم جنس نہیں تو اور قسم کا ہو گا۔

جیسے آدمی کے سانپ پیدا ہو جائے تو اس صورت میں اولاد کیا ہو گی۔ وبالِ جان ہو گی۔ یا پھر یہ کہیں گے کہ خدا کو نعوذ باللہ پیدا کرنا نہیں آیا۔ جیسا چاہا برا بھلا پیدا کر دیا۔ اس طرح خدا کی بیوی مانو تو وہ بھی اس کی ذات برادری کی ماننی پڑے گی۔ اپنے سے کم درجہ کی تو انسان اپنے حق میں بھی معیوب سمجھتا ہے تو خدا کے لئے کم درجہ کی کیسے ہو سکتی ہے۔ لبعض فرقے تو ایسے ہیں جو اس کے مفروضہ بیٹے اور مفروضہ بیوی کو اولادِ آدم سے بتاتے ہیں خدا کا رشتہ اور انسان سے ؟ کوئی جوڑ تک اور کوئی جوڑ بھی ہے۔ اس سے بڑا عیب اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کی رشتہ داری بے جوڑ مان لی۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ ماں اور بیٹا جنسِ بشر سے ہیں کیونکہ انسان سے دونوں پیدا ہوئے ہیں حضرت مریم حضرت عمران کی صاحبزادی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم کے صاحبزادے ہیں۔ لہٰذا دونوں انسان ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے وہ تمام دنیا بھر کے چیزوں کے محتاج ہیں۔ ہر وقت ان کو حاجت ہی حاجت ہے۔ ایسے محتاج کو خدا کا بیٹا سمجھنا عقل کی بات ہے ؟ کیا انھیں بھوک، پیاس، گرمی، سردی، پیشاب، پاخانے، اٹھنے، سونے جاگنے آنکھ، ناک، ہاتھ، پیر، غرض انسان کی ساری احتیاجات میں سے کوئی سی بھی احتیاج نہیں ؟ اگر احتیاج ہے تو ہم کسی انسان کو خدا یا خدا کا بیٹا کیسے کہہ سکتے ہیں ؟ وہ تو محتاج ہے اور محتاج خدا نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کیوں تسلیم کیا ؟

نصاریٰ کی دلیل تو یہ ہے کہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کو باپ کے لفظ سے یاد کیا ہے اور دنیا میں ان کا کوئی باپ نہ تھا، اس لئے خدا ہی ان کا باپ ہوا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہوئے۔

ان کی دلیل کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اوّل تو اس کی کوئی سند ہی نہیں کہ جو انجیل نصاریٰ کے ہاتھوں میں ہے ———— کہ یہ وہی خدا کی کتاب ہے جو آسمان سے اُتری تھی؟ پھر اس میں متعدد مقامات پر کاتب سے جو غلطی ہو گئی ہے اور سات آٹھ مقامات پر خود یہ لوگ دانستہ تحریف اور تبدیلی کرنے کے قائل ہیں۔ ایسی کتاب کی مستند کیسے ہو سکتی ہے؟ غریب قومیں بادشاہوں اور امیروں کو اپنا مائی باپ، کہتی ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بادشاہ اور امراء غریبوں کے حقیقی ماں باپ ہیں؟

ظاہر ہے قرینے سے دوسرا مطلب لیا جاتا ہے کہ آپ ماں باپ کی طرح ہمدرد ہیں، جیسے دلیر آدمی کو شیر اور سخی کو حاتم اور پہلوان کو رستم کہہ دینے سے کوئی حقیقت میں شیر یا حاتم یا رستم نہیں ہو جاتا۔

ملاحظہ فرمایئے انجیل ۱۰۔ باب ۴۔۳۔ اور ۸۲۔ اسی طرح زبور ۶ "میں نے تو کہا تم سب خدا ہو" تفسیر اسکاٹ میں ہے کہ مجسٹریٹ کلام الٰہی میں خدا کہلاتے ہیں اور خدا اسرائیلی حاکموں کا لقب ہے اور عبرانی زبان میں قاضی اور مفتی کہلاتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخصیص کیوں کی گئی، سارا جہان ہی خدا کے بیٹوں اور بیٹیوں سے پُر ہے۔

اب جب ہر قاضی اور مفتی خدا ہو گیا تو ان کے بیٹے لازماً خدا کے بیٹے ہوئے۔

اگر یہ مانتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام خدا کے بیٹے ہیں تو یہ بھی مان لو کہ قاضیوں اور مفتیوں کے بیٹے بھی خدا کے بیٹے ہیں ـــــ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ہی دلیل اور ایک ہی حوالہ کو ایک جگہ تسلیم کر لو اور دوسری جگہ اسی دلیل کو اور اسی حوالہ کو رد کر دو۔

توریت بھی اٹھا کر دیکھو اس میں حضرت آدم علیہ السّلام کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت یعقوب علیہ السّلام کو خدا کے پہلوٹھے بیٹے اور حضرت داؤد علیہ السّلام کو بڑے بیٹے اور تمام بنی اسرائیل خواہ وہ گمراہ کیوں نہ ہوں خدا کے بیٹے لکھا ہے۔ انجیل میں سارے عیسائیوں اور سب خاص و عام انسانوں کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔

اور اگر یہ کہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا کوئی باپ نہ تھا اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں تو حضرت آدم علیہ السّلام کے بارے میں کیا کہو گے؟ ان کا تو کوئی باپ تھا اور نہ ماں؟ حضرت حوّا کیلئے بھی کوئی آسمانی ماں تلاش کرو کیونکہ وہ بغیر ماں کے پیدا ہوئیں تھیں، آخر صرف حضرت عیسیٰ علیہ السّلام ہی کو خدا کا بیٹا بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہو ـــــ اور ابھی جو ہم نے کہا تھا کہ موجودہ انجیل میں کاتبوں کی غلطیاں پائی گئی ہیں اور اس میں کئی مقامات پر تحریف و تبدیلی کی گئی ہے۔ اس کے حوالہ کیلئے "ہارون صاحب" نامی کتاب کی جلد اوّل کے صفحہ ۱۲۶ کی تحریر ملاحظہ فرمایئے کہ گریسباخ نے ڈیڑھ لاکھ اختلاف جمع کیے ہیں "دینی مباحثہ" کے صفحہ ۵۵-۵۴ پر پادری فنڈر لکھتے ہیں۔ گریسباخ نے اور شولر نے انجیل میں تیرہ چودہ غلطیاں ایسی پائی ہیں جو آیت کے مضمون کا کچھ فائدہ نہیں

دیکھئے ایک بیماری تو جسم کی ہے جس میں ہم اور آپ آئے دن مبتلا رہتے ہیں کبھی بخار ہے کبھی نزلہ، کبھی کھانسی اٹھ رہی ہے اور کبھی چھینکیں آ رہی ہیں۔ کسی کو نمونیہ ہو گیا ہے تو کسی کو دق ایک کو سل کا مرض لاحق ہے تو دوسرے کو کینسر کا غرض صدہا قسم کے امراض ہیں۔ اور ان امراض میں کمی ہونے کی بجائے روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مغربی تہذیب کا کچھ دنوں اور تسلط رہا تو نہ معلوم کتنے اور امراض پیدا ہوں گے کہ عقل انسانی جسقدر ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اسی قدر قدرتِ خداوندی اپنی قدرت کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ انسان عاجز ہو کر رہ جاتا ہے اور کہہ بیٹھتا ہے کہ نیا مرض ہوا ہے اسکی دوائی مجھے نہیں معلوم اٹکل پچو علاج کر دیتا ہے بہر حال امراض جسمانیہ سے تو ہم اور آپ بخوبی واقف ہیں اور ان کا تدارک بھی بڑی کوشش سے کیا کرتے ہیں۔ ادھر کسی مرض میں مبتلا ہوئے اور ادھر بہترین اطباء اور ڈاکٹروں کا مشورہ حاصل کرنا شروع کر دیا تاکہ جسمانی طور پر صحت مند ہو جائیں یہ جاننے کے باوجود کہ ایک روز موت آنی ہے اور جسم کو مٹی میں ملنا ہے ہم سب جس قدر ممکن ہوتا ہے اس کو بچانے

کی کوشش کرتے ہیں ـــــــــ اور جسم کے امراض کا علاج حکماء واطباء کے تجربات پر موقوف ہے۔

ٹھیک اسی طرح روحانی امراض بھی ہیں. اور ان روحانی امراض ہی کی بناء پر دنیا میں جرائم رونما ہوتے ہیں جتنے لوگ روحانی امراض کا علاج کرا کر صحتیاب ہوتے ہیں اتنے ہی معاصی اور جرائم کا سدِّ باب ہو جاتا ہے اور جس قدر لوگ ان روحانی امراض کے علاج سے روگردانی کرتے ہیں اتنے ہی جرائم روز بروز باوجود روک تھام اور قوانین بنانے کے ترقی کرتے جاتے ہیں، دل کا سکون و اطمینان روحانی علاج سے نصیب ہوتا ہے، جسمانی امراض کا انجام موت ہے تو روحانی امراض کا انجام عالمِ آخرت کے اطمینان سے محرومی و نامرادی۔

دریافت طلب بات یہ ہے کہ جس قدرتِ خداوندی نے ہمارے جسمانی امراض کے لئے ہزار ہا قسم کی دوائیں پیدا کی ہیں تو اس نے روحانی امراض کے علاج سے تغافل برتا ہوگا؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جسم خاکی کی صحت کے لئے اتنا اہتمام ہو اور لطیفہ ربّانی کی اصلاح کا کوئی انتظام نہ کیا جائے۔ جس طرح امراض جسمانی کا علاج کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحبان ہیں۔ اسی طرح روحانی علاج کے لئے جس گروہ اور یا جس شخص کا انتخاب ہوتا ہے اس کو نبی یا پیغمبر کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی ایک بندے کا انتخاب کر لیتا ہے اور اس کو تربیت و اصلاح کا سامان دے کر خلق کی ہدایت کے لئے اس دنیا میں بھیجتا ہے۔ خدا کے اس نیک بندے کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ خدا کی مخلوق کو غلط راستہ سے بچا کر سیدھی راہ پر لے چلے۔ وہ روحانی امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے دوا بھی

بتاتا ہے اور پرہیز بھی۔ ایسی ہدایات دیتا ہے جن پر عمل کرنے سے مخلوقِ خدا روحانی امراض میں مبتلا ہو کر روحانی موت سے بچ جاتی ہے۔ اس کی تجویز و تشخیص غلطی کرنے سے پاک ہوتی ہے۔ وہ اذعان و یقین کا مقدس مجسمہ ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ظن و تخمینہ پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے حق و یقین کے ساتھ کہتا ہے۔ اس کی رائے تجربات کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ وہ جو نسخہ تجویز کرتا ہے اس پر اتنا یقین رکھتا ہے کہ ایک بار زمین و آسمان کے ٹل جانے کا تو امکان ہو سکتا ہے لیکن اس کی رائے میں غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا۔

عام مشاہدہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جو یورپ کی تقلید کو اپنے لئے مایۂ ناز سمجھتا ہے ہر بات میں یورپ کے پیچھے جا رہا ہے جو مسلمان کبھی اقتدار پرست نہ تھے۔ وہ بھی آج اقتدار پرستی کے دیوتا پر قربان ہو گئے۔ اپنی تہذیب و تمدن کو غارت کر دیا ہزاروں برس میں جو نقصان ہمارے کلچر اور ہماری ثقافت کو نہ پہنچا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اقتدار پرستی کی نذر ہو گیا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ جس قوم نے دنیا کی بد تہذیبی اور جہالت مٹا کر اسلامی تہذیب کی تعلیم دی تھی۔ وہی قوم آج خود غیروں کے دروازے پر ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو گی کہ ہم استعمار پسندوں کے دیئے ہوئے ٹکڑوں پر فخر کرتے ہیں ہم نے تو استعماری طاقتوں کی محبت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صحیح حیثیت تک کو فراموش کر دیا ______

ذرا یہ تو بتائیے کہ نبی کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ تم نے تو نبی کا مفہوم ہی بدل دیا۔ چونکہ مغرب ریفارمر، فلاسفر، گائڈ، وغیرہ کے الفاظ بولتا ہے۔ تم بھی یہی سمجھ

بیٹھے کہ نبی ایک قسم کا ریفارمر، فلاسفر یا متفکر ہی ہوتا ہے حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے وہ نہ گاندھی نہ فلاسفر ریفارمر، نہ متفکر، نہ لیڈر اور نہ اوتار وہ تو پیغمبر یعنی فرستادۂ خدا ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب اور مقرر کر کے بھیجا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو ہدایت کریں اور حق کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا و ناراضی و خفگی کے کام کون کون سے ہیں۔

ریفارمر کی رائے غلط ہو سکتی ہے۔ فلاسفر کی عقل غلط رہنمائی کر سکتی ہے۔ طبیب و ڈاکٹر کے تجربات غلط ہو سکتے ہیں۔ لیکن نبی یا رسول جو کچھ کہتا ہے اس میں غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں یقین کے ساتھ پورے وثوق کے ساتھ فرماتے ہیں۔ اس طرح علیٰ وجہ البصیرت سوائے پیغمبر کے اور کوئی نہیں کہہ سکتا۔

فلاسفر کی فلاسفی کا تو یہ حال ہے کہ سو برس گزرنے نہیں پاتے بلکہ کبھی کبھی تو اس کی زندگی ہی میں اس کے مسئلے غلط ہو جاتے ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ یورپ کے سائنس داں مریخ میں نہریں اور دریا دیکھ رہے تھے اور یہ جو دوربین لگاتے، اس میں چلتے پھرتے ہوئے آدمی نظر آتے تھے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ وہاں کے لوگ اہلِ زمین سے بات چیت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ______ پچاس ساٹھ برس تک یورپی سائنسدان دنیا کو دھوکہ دیتے رہے لیکن جونہی انسان نے خلا میں آنا جانا شروع کیا اُن کے نظریات بدل گئے اور وہ کہنے لگے کہ جن کو نہریں اور دریا خیال کیا تھا وہ ایک قسم کے نشانات تھے۔ نظریہ ڈارون نے بہت سی کھوپڑیاں جمع کر کے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا۔ ترقی کرتے کرتے آدمی بن گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کل اور کچھ بن جائے کیونکہ ارتقاء کا دروازہ بھی بند نہیں ہوا

ہے۔ بہت سے لوگ اسکی باتوں پر ایمان لے آئے لیکن اکثریت اس نظریہ کی مخالف ہے ہوسکتا ہے کہ خود ڈارون کے معتقدین بھی اسی نظریہ کے مخالف بن جائیں اور بعض کھوپڑیاں ایسی دستیاب ہو جائیں جن سے یہ نظریہ بالکل باطل ہو جائے کیونکہ چند ہڈیوں کو ملا کر اپنے قیاس سے اتنا اہم نظریہ قائم کر لینا حقیقت کو مستلزم نہیں ہے۔ پچھلے دنوں کی بات ہے۔ کچھ طلبہ نے شرارت کے طور پر ایک بکری کی ہڈی چاقو سے چھیل کر ان لوگوں کی خدمت میں پیش کر دی جو پرانی ہڈیوں پر غور کرتے ہیں اور کہہ دیا کہ یہ ہڈیاں ہم کو فلاں جنگل سے ملی ہیں چنانچہ اس ہڈی پر غور کیا گیا اور نتیجہ یہ نکالا گیا کہ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر ایک جانور سائبیریا کے علاقے میں پایا جاتا تھا۔ یہ اس کی ہڈی ہے۔ لڑکوں نے ہنس کر کہا " اجی حضور یہ تو بکری کی ہڈی ہے، جو ہم چھیل چھال کر دے گئے تھے"۔ ان ماہرین سے ملتا جلتا حال یونانیوں کا ہے، سقراط ہوں یا بقراط، بطلیموس ہوں یا جالینوس، سبھی کا کہنا ہے کہ سقمونیا سے دست ضرور آتے ہیں۔ مگر کیا ہر ایک کا معدہ سقمونیا کو قبول کر سکتا ہے۔ سونف اور کسوس سے سدّہ نکل جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی کا معدہ ثقیل ہو اور سب کچھ ہضم ہو جائے تو اس قطعی اصول کا کیا حشر ہو گا؟ ڈارون کی تھیوری کے دلدادہ لوگ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بندر کی نسل سے ہیں۔ چند بوسیدہ ہڈیوں کو سامنے رکھ لے لینے سے نظریات نہیں بن جاتے۔ ھزارہا مسائل میں فلسفیوں نے رجوع کیا ہے اور سینکڑوں تھیوریاں غلط ثابت ہو چکی ہیں۔

آسمان کا انکار، زمین کی گردش پر ایمان، مریخ میں پہلے لہروں اور چشموں کے وجود کی دعویٰ اور بعد میں صاف تردید کل کہتے تھے۔ انڈے کی زردی نہایت مفید ہے اور سفیدی بہت مضر ہے۔ پھر سفیدی کو مقوی کہا جانے لگا اور زردی صرف مریضوں کے لئے مخصوص کردی گئی۔ آج کہتے ہیں کہ سفیدی اور زردی دونوں کو ملا کر کھانا مفید رہے۔ کل تک پھلوں کی تعریف کرتے تھے، اب کہتے ہیں کہ اُن کے ساتھ ان کا چھلکا بھی کھاؤ ورنہ فائدہ نہیں ہوگا۔ شاید آئندہ یہ کہیں گے کہ گودا اور گٹھلی برابر ہیں۔ فقط چھلکا نہ کھایا کرو بلکہ گٹھلی سمیت کھاؤ کیا ان لوگوں کی آراء پر انبیاء علیہم السلام کی رائے کو جو اپنی رائے میں کوہِ استقلال ہوتے ہیں، قیاس کرتے ہو؟

تھالی کے بینگنوں اور بندر کے بچوں کے نظریات کو پیغمبروں کے ارشادات سے ٹکراتے ہو اور پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، کان کھول کر سُن لو، تمہارے فلاسفر سائنٹسٹ ریفارمر، لیڈر، گائیڈ، سب کے پاس ظن ہے، تخمینہ ہے، اٹکل و اندازہ ہے۔ تھوڑا بہت تجربہ بھی ہے مگر نہیں ہے تو حق اور مشاہدہ۔ اندازے غلط ہوتے رہتے ہیں۔ لیڈروں ریفارمروں کی رائے میں غلطی کا امکان ہے۔ روزمرّہ ان باتوں کا تجربہ ہو رہا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کی حالت ان سے علیحدہ اور منفرد ہے۔ ان کے پاس حق ہے۔ یقین ہے اور جو کچھ کہتے ہیں۔ اس پر قسم کھا کر پورے یقین و اعتماد کے ساتھ نہایت دلیری سے کہتے ہیں۔

آقائے دو جہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہجرت فرما کر

مدینہ منورہ جارہے ہیں دشمن درپے آزار ہے۔ آپ غار ثور میں موجود ہیں۔ ظالم دشمن غار کے منہ پر کھڑے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض کرتے ہیں "یارسول اللہ! دشمن ہمارے سر پر آپہنچے ہیں۔ اگر یہ لوگ ذرا جھک کر دیکھیں تو ہم نظر آئیں"

آپ انصاف سے کہیے اس وقت کسی کو نیند آسکتی ہے؟ مگر یہ سُنکر حیرت کریں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نازک وقت میں آرام فرمارہے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے استفسار پر فرماتے ہیں "اے ابوبکر فکر مت کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ____ وہ اطمینان جو خدا کے پیغمبروں کو نصیب ہوتا ہے اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ریفارمر اور پیغمبر میں کیا فرق ہے؟ پیغمبر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خدا کی وحی کو سُنکر حق الیقین کے ساتھ کہتا ہے وہ قصہ تو پچھلے صفحات میں آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ چار اندھوں نے ہاتھی کو ٹٹول کر اپنے اپنے اندازے کے مطابق کن الفاظ میں تعریف کی تھی۔ اتفاق سے ایک آنکھوں والے نے ان سب کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ اندھے اُلٹا اُس کے سر ہوگئے بولے "واہ میاں، ہمیں بے وقوف بناتے ہو ہم نے خود ہاتھی کو ٹٹولا ہے۔ ہم جانتے ہیں وہ کیسا ہے۔ جاؤ اپنا راستہ ناپو، بڑے آئے سمجھانے والے"!

اس آنکھوں والے نے ان کو بہتیرا سمجھایا، قسمیں کھائیں۔ یہ کہا کہ بھائی تم نے تو محض ٹٹول کر اندازہ لگایا ہے جب کہ میں نے ہاتھی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر انھوں نے اس کی ایک بات بھی نہ مانی، اپنی ہی کہے گئے۔ انھیں اپنی

کہہ گئے۔ اُنھیں اپنی ٹٹول اور اندازے پر اتنا یقین تھا کہ آنکھوں والے کی تکذیب کر دی گویا ظن و قیاس سے مشاہدہ کو شکست دینا چاہی اور نازک شیشے سے پتھر کی چٹان کو توڑنا چاہا۔

پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آسمان سات ہیں اور میں ہر آسمان پر گیا ہوں مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں کیں ہیں،، مغربی تہذیب کے والہ و شیدا کہتے ہیں کہ آسمان کوئی چیز ہی نہیں، یہ تو محض حدِّ نظر ہے .... حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "جنّت و دوزخ کا وجود ہے میں ان دونوں کی سیر کر کے آیا ہوں"

مغربی مفکّرین اپنے اندازے سے کہتے ہیں "جنّت و دوزخ کوئی چیز ہی نہیں"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں "مرنے کے بعد وہ دوبارہ زندگی ہے۔ برزخ میں نکیرین کے سوال جواب ہوتے ہیں۔

مغربی سائنسدان کہتے ہیں "مرنے کے بعد روح و جسم باقی نہیں رہتا"

سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرماتے ہیں "میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہوں کہ قبر میں عذاب و ثواب ہو رہا ہے"

مغرب کے لوگ اپنے ظن اور اندازے سے بات کر کے انکار کر دیتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "جنّت میں ایک شخص کو دیکھ کر آیا ہوں، وہ بے فکرا جنّت میں لوٹ لگا رہا ہے۔ میں نے اُسے دیکھ کر حضرت جبرئیل علیہ السّلام سے پوچھا؟ "یہ کون شخص ہے جو اتنی مسرّت سے

قلابازیاں کھا رہا ہے۔؟"

حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے کہا "اس شخص نے راستے سے ایک کانٹے دار درخت کو کاٹ کر پھینک دیا تھا کیونکہ اس سے راستہ چلنے والوں کو سخت تکلیف ہوتی تھی، راہگیروں کی تکلیف دور کرنے کا اس کو یہ صلہ دیا گیا ہے"۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مطلع فرماتے ہیں "چغل خوروں کے گلے چیرے جاتے ہیں۔ میں نے زانی مردوں اور عورتوں کو آگ کے تنور میں جلتے دیکھا ہے"۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر ارشاد برحق۔ وہ جو کچھ فرماتے ہیں، آنکھوں سے دیکھنے کے بعد فرماتے ہیں۔ دوسری طرف کینٹ اپنے خیال کے بل بوتے پر آخرت کی زندگی کا انکار کرتا ہے۔ نطشے حیاتِ ثانیہ کا قائل نہیں، بقراط کے نزدیک صرف یہی دنیا جنّت و دوزخ ہے

ان مفکرین کے اسی قسم کے لغو اور مضحکہ خیز قیاسات ہیں جب کہ اللہ کے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس عینی مشاہدہ ہے ———— بتائیے کینٹ اور نیوٹن اور نطشے کی باتیں مانی جائیں یا محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قول؟ یہاں رائے سے رائے کا مقابلہ تخمین سے نہیں۔ بلکہ رائے اور مشاہدہ کا مقابلہ ہے۔ آفتاب غروب ہونے والا ہو لیکن ایک شخص گھر میں بیٹھ کر محض اندازے اور قیاس سے کہے کہ آفتاب ڈوب چکا ہے۔ دوسرا شخص مکان کے بالائی حصّے پر کھڑا ہوا آفتاب کو آنکھ سے دیکھ رہا ہو، وہ یہ سُن کر کہے، "آفتاب اُفق پر موجود ہے۔ ابھی غروب نہیں ہوا ہے"۔ اب دونوں میں آپ کس کا یقین کریں گے؟ بھلا اندازے اور قیاس سے بات کہنے والا

آنکھ سے مشاہدہ کرنے والے کی تکذیب کر سکتا ہے ؟ اگر کرے تو یقیناً بیوقوف ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی باتوں کو ہرگز نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ وحی الٰہی تو مشاہدہ سے بھی زیادہ قوی اور قابلِ اعتبار ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے ارشاد پر مبنی ہے اور خدائے تعالیٰ کی بات میں غلطی کا احتمال تک نہیں ہو سکتا۔ وہ سب صدق ہی صدق ہے اور اس کو بیان کرنیوالے صادق القول ہوتے ہیں، خدا کا قول سچا اس کو لانے والے سچے جن پر وحی الٰہی نازل ہوئی وہ سچے، سارے ذرائع اس وحی کی آمد کے سچے اور معتبر لہٰذا وحی الٰہی بھی برحق اور سچ ہے۔ اسکی شہادت دینا اور ایمان لانا ہر ذی عقل کا فرض ہے۔

جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور کمالات کے ساتھ موجود ہے اور وہ احکم الحاکمین ہے اور باقی سب اس کی مخلوق ہے تو مخلوق و محکوم کو اپنے خالق و حاکم اعلیٰ کی مرضیات معلوم کرنا چاہیئیں یا نہیں؟ بیشک بندگانِ خدا کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلوم کریں کہ ان کا رب کس کس بات پر خوش ہوتا ہے تا کہ وہ ان باتوں کو انجام دیں اور پتہ چلائیں کہ کون کون سی باتیں اس کی خفگی اور ناراضی کا باعث بنتی ہیں تاکہ ان سے اجتناب کیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ خدا تعالیٰ ایک ایک بندے کے پاس آکر اپنا پیغام نہیں دے گا۔ آخر وہ بے نیاز ہے۔ یہ تو اسکی رحمت ہے کہ اُس نے اپنے پیغامات اور فرامین بندوں تک پہنچانے کے لئے پیغامبر منتخب کئے اور ان کو اپنے پیغامات دیکر کہا "میرے بندوں تک یہ پیغام پہنچادو" ان پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کے یہ کل احکام اس کے بندوں تک من وعن پہنچا دیئے۔

اللہ تعالیٰ کے پیغامات لانے والوں میں سب سے افضل خدا کے آخری پیغمبر جناب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان پر ایمان لانا اور ان کے فرمان کے مطابق تمام اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور معاشرت

کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ہی نجاتِ ابدی کا سبب ہے۔ یہی ایک نسخہ کیمیا ہے جس کو ماننے، قبول کرنے اور عمل میں لانے کے بعد ہی دونوں جہان کا آرام ہے ورنہ ہر دو جگہ تباہی اور بربادی لازمی ہے۔

اگر واقعی یہ دنیا اپنی نجات کے لئے بے چین ہے تو اس کے لئے راحت و تسکین صرف ایک ہی ہے اور صرف اسی ایک زندگی میں ہے۔ چونکہ دکھ اور مرض سب کا ایک ہے۔ اس لئے شفا کے نسخے بھی ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ ساری کائنات کا پروردگار ایک ہے جو اپنے ایک ہی آفتاب کو ہر تر و خشک پر چمکانا اور ایک ہی طرح کے بادلوں سے آباد و ویرانے کو شاداب کرتا ہے بس اس کی ہدایت کا آفتاب بھی ایک ہی ہے اور گو بہت سے ستارے اسی کی روشنی سے اکتساب نور کرتے ہیں مگر ان سب کا منبعِ نورانیت ایک ہی ہے۔ اور تمام کرۂ ارضی کی روشنی کے لئے آفتاب ہدایت ہے جس کی عالم تسخیر کرنوں کے ذریعہ یہ دنیا اپنی تمام تاریکیوں کو دور کرنے کے لئے نورِ بشارت پا سکتی ہے۔

اور وہ آفتاب ہدایت جناب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس مقدس نبی، صادق و مصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میں صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے آیا ہوں یا خدا کی محبت صرف سینا کی چوٹیوں اور ہمالیہ کے نیچے بسنے والوں کے لئے محدود و مخصوص ہے بلکہ اس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمام عالم انسانیت کو غیر الہٰی غلامیوں سے نجات دلانے آیا ہوں" اس نے اسی رب العالمین کی عبادت کی دعوت دی جو تمام جہان کا پروردگار ہے اس نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ میں

وحدہ لاشریک رب العالمین کا بھیجا ہوا آخری رسول ہوں، تمہارا خدا صرف ایک ہی خدا ہے اور وہی قابلِ عبادت ہے۔ اس نے کرۂ ارضی کی پیٹھ پر بسنے والے سارے انسانوں کو میرے ذریعہ خطاب کیا ہے۔ اس کی شریعت میں نسلِ انسانی کی تفریق نہیں بلکہ اتحاد و الفت ہے۔ اس کا پہلا کلمۂ طیّب یہ ہے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ

عقل و دانش کے لئے کوئی مانع نہیں وہ اعماقِ قلب سے تصدیق کرے کہ خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں اور حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کے نبی ہونے کی کیا دلیل ہوتی ہے۔ یوں تو ہر آدمی نبوّت کا دعویٰ کر سکتا ہے اور اس کا دعویٰ غلط ہو سکتا ہے۔ جیسے مسیلمہ کذّاب یا اسود عنسی یا مرزا قادیانی نے کہہ دیا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ حالانکہ ان میں سے ایک بھی نبی نہیں۔ پھر نبی کی پہچان کس طرح ہو سکتی ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ نبوّت کا دعویٰ کرنے والے صدق و امانت حسنِ صورت و سیرت، برگزیدگی، حسب و نسب، عُلوِ ہمّت، کمالِ عقل و دیانت اور کمالِ فہم و فراست سے موصوف ہوتے ہیں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہدایت کے لئے آئے ہیں پھر ان کے ہاتھوں سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں جو قدرتِ بشری اور طاقتِ انسانی سے باہر ہیں مثلاً بڑی مقدار میں دہکتی ہوئی آگ ہو اور ایک انسان کے جاتے ہی بغیر کسی ظاہری اسباب کے

ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جائے اور لکڑی سچ مچ کا سانپ بن کر چلنے اور چیزوں کو نگلنے لگے اور مُردے کو زندہ کر دینا۔ مادر زاد اندھے کو سوانکھا کرنا، مٹی کے پرندے کو اپنی پھونک سے زندہ کر کے اُڑا دینا اور بہتے ہوئے دریا کی سطح پر عصا مار کر دریا سے بارہ راستے نکال دینا اور انگلیوں سے فوّارے کی طرح پانی نکلنا اور انگلی کے اشارے پر چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا اور درختوں اور جانوروں کا انسانوں کی طرح بات کر کے تصدیق کرنا اور لکڑی کا انسانوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا اور کنکریوں کا کلمہ پڑھنا وغیرہ وغیرہ ان افعال کو معجزات کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایسے افعال ہیں جن کو سوائے علیم و حکیم قادر مطلق حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کے کوئی انسان انجام نہیں دے سکتا۔ اس لئے جن کے ہاتھوں سے معجزے ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے کی دلیل ہوتے ہیں۔ اس قسم کے معجزات مفتری اور کذاب سے ظاہر نہیں ہو سکتے جھوٹے زیادہ سے زیادہ شعبدہ بازی اور سحر کا سہارا لے سکتے ہیں۔ معجزہ صرف نبی سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انبیاء علیہم السّلام کی لائی ہوئی شریعت اور ان کے علوم میں ذرا سا غور کرنے سے یہ بات خوب اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے علوم و معارف کا صدور اس شخص سے ہو سکتا ہے۔ جو خدا کا برگزیدہ بندہ، سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ سچّا، سر تا پا محاسن و مکارم، محامد و شمائل اور علوم و معارف کا منبع اور سرچشمہ ہو، برخلاف کذّاب کے کہ اس سے ان علوم و معارف کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

انبیاء علیہم السّلام جو پیشن گوئی کرتے ہیں وہ من وعن ویسی ہی سامنے

آتی ہے جیسا وہ فرما چکے ہوتے ہیں۔ کاذب کی بات تو بیس سال میں خود ہی کھل کر سامنے آجاتی ہے مگر انبیاءؑ کا صدق قیامت تک باقی رہتا ہے۔

معجزہ کی تعریف

خارقِ عادت، بلا اسباب عادیہ کے نبی کے ہاتھ پر جو ایسا کام ظاہر ہو، جسے دوسرے لوگ بلکہ تمام دنیا کے لوگ مل کر بھی نہیں کر سکتے اُسے معجزہ کہتے ہیں۔ اگر ایسا ہی کام کسی ولی اور صالح کے ہاتھ پر ہو تو اُسے کرامت کہتے ہیں، جیسے ایک سیر جو سے صدہا آدمیوں کا پیٹ بھر جانا اور ایک پیالے پانی سے سینکڑوں۔ آدمیوں اور جانوروں کا پانی پی کر اپنے برتن بھر لینا اور پھر بھی کھانے اور پانی کا اتنے کا اتنا باقی رہ جانا۔

معجزہ اور سحر کا فرق

سحر تو ایک فن ہے جسے ہر شخص حاصل کرلے۔ معجزہ کسی کی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ اللہ کی عطا ہے، جس کو چاہے مرحمت فرما دے پھر سحر باطل ہو سکتا ہے۔ جب کہ معجزہ کو سارے انسان مل کر بھی باطل نہیں کر سکتے اور عاجز رہ جاتے ہیں۔

نوجوانوں کی حالت

آج کل نوجوان ذہن کی باتوں پر ہنسا کرتے ہیں۔ جہاں کسی پیغمبر کے معجزے کا ذکر آیا یا ولی کی کرامت کا ذکر ہوا آیا اور یہ چیخ کر بولے "مولوی صاحب! یہ بیسویں صدی ہے اس زمانے میں آپ لوگوں کو معقول معقول قسم کی باتیں کرنی چاہییں۔"

گویا بیسویں صدی اتنی معقول ہے کہ اس میں اللہ کے مقدس بندوں کے معجزات و کرامات کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ بھلا اس سے "زائد نامعقولیت" اور کیا ہوگی کہ بیسویں صدی میں دین و ایمان کا سودا کیا جا سکتا ہے اور شریعت بیچی جا سکتی ہے۔ اس بیسویں صدی میں بازاری عورتیں اپنی شرمگاہوں کا علی الاعلان بھاؤ تاؤ کر سکتی ہیں۔ اس بیسویں صدی میں ماں باپ، بیٹا بیٹی ایک ساتھ فحش اور عریاں فلم میں جا سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر لڑکے لڑکیاں والدین کے ساتھ فحش عورتوں کے گانوں اور عریاں ناچوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ باپ اپنی بیٹی کے رقص پر فخر کر سکتا ہے۔ اس بیسویں صدی میں ایسا لباس پہنا جا سکتا ہے کہ ننگے جسم پر صرف ایک چیتھڑا لپیٹ لیا جائے ایک اجنبی مرد ایک اجنبی عورت کے ساتھ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچ سکتا ہے۔ اس بیسویں صدی میں ننگوں کے کلب تیار کئے جا سکتے ہیں، بدتہذیبی، بے ایمانی، بد دیانتی، بے غیرتی سخت گیری سب پر عمل ہو سکتا ہے۔ اس بیسویں صدی میں ہر قسم کی ملاوٹ کی جا سکتی ہے اور ہر گناہ کو فن کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن خدائی تہذیب کے لئے دروازہ بند ہے۔ بول بھی نہیں سکتے کچھ کہنے کی جرأت کرو تو نامعقول باتیں کرنے کا طعنہ سننے کو ملے۔

کوئی شک نہیں کہ آج کی دنیا آئین کی دنیا ہے۔ آج کی دنیا خواتین کی دنیا ہے۔ سائنس کی دنیا ہے۔ ہر طرف علم کا چرچا ہے۔ ہر محلے میں کئی بی اے اور ایم اے لڑکے لڑکیاں سو دو سو روپئے کی ملازمت کے لئے کوشش کرتے ہوئے مل

سکتے ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کیا آئینی نہیں ہے؟ بالخصوص جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک وطیّب زندگی تو اعجاز ہی اعجاز ہے۔ تم کب تک ہمیں نامعقول باتیں کرنے کا طعنہ دیکر معجزات کا انکار کرتے رہو گے؟ ایک روز خود ہی کہہ اٹھو گے کہ ایک اُمّی انسان کا بطحا کے کنکروں پر بیٹھ کر مکمل ترین قانون بنا دینا بہت بڑا معجزہ ہے۔

ذرا وکلاء کے پاس جاکر معلوم کرو کہ دنیوی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں رات دن تنسیخ و ترمیم ہوتی رہتی ہے یا نہیں، سزاؤں میں جرمانوں میں، دفعات میں کتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں اس کا توصحیح طور پر اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ جج کا فیصلہ مستقل ایک قانون بن جاتا ہے انگلینڈ میں قانون بنتا ہے کہ سزائے موت بے رحمی اور سنگدلی کی علامت ہے۔ اچھے معاشرے میں پھانسی کی سزا نہیں ہونی چاہیئے روس میں معمولی سی غلطی پر انسان کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے تاکہ معاشرہ ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہو جائے مگر نہیں ہوتا، دنیاوی قوانین کی تبدیلیوں انتہا پسندوں اور ترمیموں سے قیاس کا اندازہ لگاؤ اور پھر سوچو کہ . . . .

"ایک پاکباز انسان ہے جو ایک بیوہ خاتون کے گھر کا چراغ بنا اس کو یتیم سمجھ کر ایک غریب گھرانے کی دائی دودھ پلانے کے لئے لے گئی۔ اس بے سروسامانی اور غربت میں اُس نے پرورش پائی چند دن بعد شفیق ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ دادا بھی انتقال کر گئے۔ کوئی لکھانے پڑھانے والا نہیں۔ جس ملک میں پیدائش ہوئی وہاں کے لوگ لکھنے پڑھنے کو

ہی عیب سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں پڑھاتا کون؟ نہ کبھی قلم و دوات کی صورت دیکھی اور نہ سلیٹ پنسل کا مرہون منّت ہوا۔ نہ کسی اُستاد کے آگے زانوئے ادب طے کیا اور نہ وہ پاک بچہّ کسی مدرسہ میں داخل ہو سرزمین حجاز میں نہ کوئی اسکول تھا نہ کوئی کالج اور نہ کہیں کسی مکتب کا پتہ نشان تھا۔ داخل کہاں ہوتا؟ داخل کون کراتا؟ پڑھانے والا کہاں سے آتا؟ اوّل تو کوئی سرپرست نہیں۔ پھر تعلیم کا سرے سے رواج اور انتظام نہیں۔

اس وادئ غیر ذرع میں امّی اور یتیم اپنی پھٹی ہوئی کملی بچھا کر بطحٰی کے سنگریزوں پر بیٹھ جاتا ہے اور مادّی اسباب کے فقدان کے باوجود ایک مکمل ترین قانون پیش کرتا ہے۔ نہ اس کے پاس کوئی ٹیلی فون ہے۔ نہ وہاں کوئی اخبار ہے۔ نہ لائبریری ہے اور نہ کوئی اسمبلی ہال نہ قانون کی موٹی موٹی کتابیں ہیں اور نہ قانونی مشیر اس بے سروسامانی کے عالم میں وہ قانون بنائے اور ایسا قانون بنائے جو قیامت تک کے لئے ہو اور اٹل ہو اور چودہ سو برس میں اس کا بنایا ہوا قانون ایک ترمیم ایک اضافہ، ایک معمولی سی تبدیلی تک قبول نہ کرے؟ بتاؤ کیا یہ اعجاز نہیں ہے۔ کیا یہ انسانی طاقت کا کام ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قانون پیش کیا، اس میں اتنی لچک ہے کہ چودہ سو صدیوں سے ہر صدی کے مزاج کے مطابق ثابت ہوا ہے اور تا قیامت یونہی ثابت ہوگا۔ کیا تمہارے پاس کسی دنیاوی قانون کی کوئی ایسی مثال ہے۔ دیکھو بڑے بڑے قانون دان اور بڑے بڑے ماہرین قانونِ محمڈن لاء یعنی قانونِ محمدی کے سامنے کس طرح دوزانو سرنگوں بیٹھے

ہوئے ہیں کیا امریکہ جیسی مملکت نے طلاق کا قانون پاس نہیں کیا؟ کیا بھارت نے قانون پاس کر کے اب بیواؤں کو شادی کرنے کی اجازت نہیں دے دی؟ صرف طلاق اور بیوہ کی شادی ہی نہیں بلکہ اسلام کا وہ کون سا قانون ہے جس کو دنیا کی قوموں نے الٹ پلٹ کر کسی نہ کسی طرح رائج نہ کیا ہو بعض قوانین تو بعینہٖ اُٹھا کر رکھ لئے ہیں اور بعض کو تھوڑے رد و بدل کے ساتھ نئے نام سے رکھ لیا ہے۔

یہ پڑھی لکھی دنیا چونکہ ڈپلومیسی کی دُنیا ہے۔ اس لئے نہ تو اپنے عجز کا اقرار کرتی ہے اور نہ اسلام کا احسان مانتی ہے بلکہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے سینکڑوں حیلے اور جھوٹی تاویلیں گڑھتی اور تراشتی رہتی ہے۔ اسکی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص مرتے وقت اپنا ایک ذاتی کتب خانہ چھوڑ گیا۔ اس کا کم عمر لڑکا تھا جسے تعلیم کے لئے ایک ماسٹر کے حوالے کر دیا گیا۔ ماسٹر نے لڑکے کو کبھی باپ کے کتب خانے کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ اگر کبھی وہ بیچارہ کتب خانہ کا تذکرہ کرتا تو ماسٹر کہتا "اس میں ملائیت بھری ہے۔ خبردار ایک کتاب کو بھی ہاتھ نہ لگانا ورنہ عمر برباد ہو جائے گی کام کے نہ رہو گے"۔

یہ بات لڑکے کے دل میں جم گئی کہ ہو نہ ہو ملائیت کوئی ایسی بلا ہے کہ لپٹ گئی تو چھڑائے نہیں چھوٹے گی۔ مگر جب اُس نے بی اے پاس کر لیا اور سوجھ بوجھ ہوئی تو ماسٹر کے پاس علمی سرمایہ نہیں۔ لڑکے کو پڑھنے کی پیاس اور لگن تھی ——— ماسٹر نے ترکیب یہ نکالی کہ اس کے مرحوم والد کے کتب خانے میں جاتے ایک کتاب نکال لیتے اور ٹائیٹل بدل بدل کر لڑکے

کے سامنے پیش کر دینے کہ جدید مصنفین کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے۔ وہ پڑھ کر خوب داد دیتا۔ ایک دن کسی کتاب میں اس نے اپنے والد کا نام لکھا ہوا دیکھا۔ اُسے شبہ ہوا کتب خانے میں جاکر کتابیں دیکھیں تو کتابیں اسی کتب خانے کی چرائی ہوئی تھیں، البتہ ٹائیٹل اور عنوانات بدل دیئے گئے تھے۔ اب اُسے افسوس ہوا کہ مجھے میرے والد کے ورثہ سے ملائیت اور قدامت پرستی کہہ کر نفرت دلائی کہ والد کا مرہون منت بننے کے بجائے ماسٹر کا مداح بن جاؤں

بس یہی بربادی یہاں ہوئی ہم مسلمانوں کو تو ملائیت اور نامعقولیت اور جہالت کہہ کر ہمارے اپنے علوم سے محروم رکھا کہ کہیں خدا اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرہون منت نہ ہو جائیں۔ اور خود جدید علوم اور جدید قوانین کے نام سے عنوانات میں تغیر و تبدیلی کر کے ہمارے علوم ہمارے ہی سامنے پیش کر دیئے۔ اب ہم ہیں کہ غیروں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ملائیت سے نفرت ہونے کے باعث یہ نہیں کرتے کہ ایک نظر اپنے کتب خانے پر بھی ڈال لیں ـــــــ پھر یہ تو برسبیل تذکرہ ایک بات درمیان میں آگئی۔ ڈپلومیٹ حضرات کو اپنی ڈپلومیسی مبارک رہے۔

ذکر تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ جن کی مقدس و مبارک زندگی کا ایک ایک گوشہ اعجاز تھا۔ انقلاب سے لبریز تھا۔ ان کے معجزات کا انکار کیونکر ممکن ہے۔ بذاتِ خود ان کی حیات طیبہ ایک معجزہ ہے کہ کسی ظاہری تعلیم کے بغیر وہ علوم اوّلین و آخرین کے مالک ہیں۔ ان کی شریعت بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے تحت قیامت تک رہنے والی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ

خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تیئیس ۲۳ سال کی قلیل ترین مدت میں جاہل اجہل قوم کو جو الٰہیات سے بالکل ناآشنا تھی، کتنے بلند مرتبے پر پہونچا دیا کیا یہ اعجاز نہیں ؟ عرب کی جہالت اور علم الٰہی سے ناواقفیت کی تاریخ ایسی نہیں جو کسی سے پوشیدہ ہو، اہل عرب کی توہم پرستی، دین الٰہی سے بیگانگی اور بت پرستی کے قصے تم نے پڑھے بھی ہوں گے اور سنے بھی ہوں گے ۔ جس قوم کی یہ ذہنیت ہو کہ ایک معبود کے نام سے گھبراتی ہو تو صبح سے شام تک ہر اچھے اور خوبصورت پتھر کو تراشں کر اپنا معبود بنا لیتی ہو وہ انبیاء علیہم السلام کی توحید کو کس طرح سمجھ سکتی تھی ؟ جو قوم بکریوں کا دودھ پی کر لڑکیوں کو زندہ گاڑ کر اور اونٹ کا گوشت کھا کر زندہ رہنے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھتی ہو، جو خدا کی ذاتِ اقدس سے ناواقف ہو اور نہ مرنے کے بعد جی اٹھنے کی قائل ہو، نہ رسالت سے آشنا اور نہ تہذیب انبیاء سے اس کا کچھ واسطہ ہو جو اپنے مرنے جینے کا سہارا صرف زمانے کو جانتی ہو اور تین سو ساٹھ بتوں کے آگے سر جھکا کر خانہ کعبہ میں برہنہ ہو کر طواف کرنے کو منتہائے عبادت سمجھتی ہو، اس جاہل قوم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑے عرصے میں ایسا خداشناس اور مہذب و متمدن بنا دیا کہ وہ تمام عالم کے لئے شمعِ ہدایت بن گئے ۔ ایک ایک چراغ سے لاکھوں چراغ ایسے روشن ہوئے جو تیز اور تند مخالف ہواؤں کے طوفانوں میں ثابت قدم رہے اور اپنے نور سے ظلمت کدہ کفر کی تاریکی کو دور کر کے منور کرتے رہے کیا یہ اعجاز نہیں ہے ؟ ۔

یہ دل لگی نہیں کہ عرب کی ایک جاہل قوم کو قلیل ترین مدت میں دنیا وآخرت کے انتہائی رموز ومعارف سے آگاہ کر دیا جائے۔ اتنی بڑی بُت پرست قوم کو دیکھتے ہی دیکھتے بُت شکن بنا دیا جائے۔ ناشناسِ فطرت آشنائے ذات وصفات خداوندی ہو گئے۔ وہ مشرک جن کی گھٹی میں شرک پڑا ہوا تھا موحّدین بن گئے۔ خانہ کعبہ جو بتوں سے بھرا تھا، از سرِ نو خدا کا گھر بنا دیا گیا۔

غرض سینکڑوں معجزات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئے ان کی نبوت ورسالت اظہر من الشمس ہے۔ وہ بے شک خدا کے سچّے برحق رسول ہیں۔

شہادتِ کائنات

عبدالرحمٰن بن ہارون مغربی سے منقول ہے کہ میں قسطنطنیہ کے قریب جزیرۂ دیر کے قریب کشتی کے اندر سوار ہوا، ہمارے ساتھ کشتی میں ایک صقلی غلام بھی تھا اس نے وہاں سمندر میں ایک جگہ جال ڈالا اور انسان سے ملتی جلتی ہوئی ایک مچھلی شکار کی ہم نے اسکو دیکھا تو اس مچھلی کے دائیں کان کے نیچے لاالٰہ الا اللہ اور اسکی پیٹھ پر محمّد اور بائیں کان کے نیچے رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔

نزہتہ المجالس میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ نہاد میں مسلمانوں نے ایک کافر کو پکڑا اس سے قبل کافروں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ جو مسلمان ان کے قبضہ میں آتا اُسے زندہ جلا دیتے یا داشش کے لئے مسلمانوں کی رائے ہوئی کہ اس کافر کو جلا دیا جائے چنانچہ اس کو لکڑی کے ایک

بکس میں بٹھلایا گیا اور اس کافر نے اپنے ایک ایک بُت کو پکارنا شروع کیا مگر جب دیکھا کہ کوئی کام نہیں آتا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی اور کہا کہ اب میں ایمان لاتا ہوں اے خدا مجھے زندہ جلنے سے بچالے، اسی وقت شدید قسم کی آندھی آئی اور اس لکڑی کے بکس کو جس میں وہ آدمی تھا اُڑا لے گئی اور دور دراز کسی مقام پر ایک باغ کے اندر اس بکس کو اُتار دیا۔ یہ شخص باہر نکلا تو وہاں کالے رنگ کے گلاب کے پھول کھلے ہوئے نظر آئے جب اُس نے قریب جاکر دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی ہر پھول کی پنکھڑی پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ قدرتی طور پر لکھا ہوا تھا۔ اس کا خیال ہوا کہ شاید ان پر کسی نے لکھ دیا ہوگا۔ چنانچہ کلی توڑی تو اس کے اندر بھی ہر پنکھڑی ایسی ہی نکلی جس پر کلمہ طیبہ تحریر تھا۔

وہاں کے لوگوں نے اس اثناء میں ایک اجنبی کو دیکھا تو حال احوال پوچھا۔ اس نے سب ماجرا کہہ سنایا اور کہا: "تم لوگ مسلمان ہو؟" انھوں نے کہا "نہیں" تب اُس نے پھول دکھلائے کہ ہر پنکھڑی پر اسلام کا کلمہ طیبہ تحریر ہے۔ وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ہم تو اپنے سیاہ گلابوں کو ہمیشہ ایسا ہی پاتے ہیں۔ اُس شخص نے ان کو کلمہ کے مطلب اور حقیقت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد وہاں کے باشندے بھی مسلمان ہو گئے۔

ہندوستان کے مختلف مواضع کے بیسیوں آدمیوں نے رات کے وقت آسمان پر تاروں کی طرح چمکتا ہوا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا دیکھا جو کافی دیر تک آسمان پر نظر آتا رہا۔ متعدد لوگوں نے اُسے دیکھنے کی شہادت دی

اسلام ایک فطری مذہب ہے اس کی ساری تعلیمات درست و صحیح ہیں۔ یہ آسمانی مذہب ہے۔ اس سے روگردانی کرنا ٹھیک نہیں، دنیا و آخرت کی پریشانیوں سے بچنے کے لئے اُسی پر قائم رہو اور نجات کے لئے دوسروں کو اسکی دعوت دو۔

ہم اپنے کچھ کاموں کو اچھا سمجھ کر انجام دیتے ہیں اور کچھ کاموں کو بُرا سمجھتے ہیں لامحالہ ہمارے ان کاموں میں ایسے بھی کام ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہوں اور ایسے بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوں لیکن رضائے الٰہی کو دریافت کرنے سے ہماری ناقص عقلیں قاصر ہیں کیونکہ بعض عقلاء ایک کام کو بدلیل عقل اچھا سمجھتے ہیں اور بعض بُرا۔ یہ عقلوں کی کمزوری ہے۔ خدا کی مرضی خود اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر محض عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اللہ کی طرف سے کوئی شخص آنا چاہیئے جو اسکی مرضی و نامرضی کی اطلاع دے تاکہ ہم مبتلائے عذاب نہ ہوں، اللہ رحیم و کریم ہیں۔ انھوں نے ہماری ہدایت اور اور رہنمائی کے لئے ایسے پاک باز انسانوں کا انتظام فرمایا جنھوں نے ہمیں خدا کی رضا اور خوشنودی، ناراضگی و ناخوشی کے کاموں سے آگاہ فرمایا ان پاکباز انسانوں کو اللہ کے رسول کہتے ہیں۔

اس طرح ہر شخص اللہ تعالیٰ سے ہم کلام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کوئی شخص ایسا واسطہ کے طور پر درمیان میں ہونا چاہیئے جسے طرفین سے مناسبت ہو

تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرکے اس کی مخلوق کو اس کے احکام پہونچائے۔

پیغمبر معجزہ اپنی تصدیق کے لئے دکھایا کرتے ہیں۔ تاکہ سچ اور جھوٹ معلوم ہو جائے۔ مسیلمہ کذاب سے کسی نے کہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اندھے کی ایک آنکھ کے لئے دعا کی تھی۔ وہ اچھی ہوگئی۔ اگر تم بھی نبی ہو تو دوسری آنکھ کے اچھا ہونے کی دعا کردو۔ اس نے دعاء کی تو پہلی بھی جاتی رہی اور دونوں سے اندھا ہوگیا۔

یونہی ایک جھوٹے مدعی نے ایک بڈھے پھونس بیمار پادری آتھم کی موت کا دعوٰی کیا تھا کہ اگر میرا دعوائے نبوت سچا ہے تو وہ پادری تین چار سال کے اندر مر جائے گا۔ دعوٰی کرتے وقت اسکو یقین تھا کہ بڑھاپے اور بیماری کے باعث آتھم تین ماہ بھی زندہ نہیں رہ سکے گا لیکن آتھم زندہ رہا اور عیسائیوں نے دعوٰی کی مدت کے ختم پر آتھم کا بڑا شاندار جلوس امرتسر میں نکالا۔

لیکن پیغمبر کا دعوٰی پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ بار آسمان اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے لیکن اس کے دعوٰی پر آنچ نہیں آسکتی۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ اس کا دعوٰی غلط ہو اور اس کی الٹی سیدھی غلط تاویلیں سوچکر یہ کہنا پڑے کہ یہ مطلب نہیں بلکہ یہ مطلب تھا۔

رسول کی تعریف رسول اس کامل بشر کو کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے لوگوں کو اس کے احکام پہونچائے اور نبوت کا دعوٰی کرکے اپنی تصدیق کے لئے معجزے دکھلائے یہ سب اوصاف رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ کمال موجود ہیں آپ کے معجزات میں ایک معجزہ قرآنِ مجید ہے۔

قرآن معجزہ ہے

معجزہ وہی ہے جس کے سامنے دنیا کے سارے انسان عاجز ہو جائیں چودہ سو برس قبل قرآن پاک نے دعویٰ کیا کہ اگر یہ کلام الٰہی نہیں تو تم ایسی ہی ایک سورت یا آیت بنا کر دکھلا دو۔ مگر نہ بنا سکے۔ سب عاجز ہیں۔ دعویٰ آج تک موجود ہے۔ کفّار عرب جو فصاحت و بلاغت میں ساری دنیا کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے آخری دم تک ایک آیت بھی نہ پیش کر سکے۔ حالانکہ انھوں نے کیسی کیسی کوشش نہیں کی۔ اپنا مال و جان سب قربان کر دیا مگر دعویٰ جوں کا توں باقی ہے اور آج بھی قرآن پکار پکار کر یہی دعویٰ کر رہا ہے ——— یہی دلیل ہے اس کے معجزہ ہونے کی۔

پھر اتنی ہی ضخیم کتاب دوسری ہو تو کبھی حفظ نہ کر سکے۔ نہ اس کے اتنے حفّاظ ہو سکیں۔ ہم نے ایک حافظ ڈکشنری کو دیکھا ہے۔ جو ڈکشنری رٹ کر نیم پاگل ہو گئے تھے، اور بعد میں ڈکشنری بھی حفظ نہ رہی۔ البتہ یادگار کے طور پر پاگل پن باقی رہ گیا تھا۔ یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ نو سال کا بچّہ تمام قرآن حفظ کر کے فر فر سنا دیتا ہے۔ حافظِ قرآن کے حافظے اور ذہن میں بھی قوّت کا اضافہ ہوتا ہے۔ لاکھوں حفّاظ موجود رہتے ہیں جو زیر زبر کا فرق فوراً پکڑ لیتے ہیں۔ کسی اور کتاب کا حافظ کوئی دکھا دے۔

قرآن کو جو شخص سمجھ کر پڑھتا ہے۔ وہ نہایت متّقی، خدا ترس انسان

بن جاتا ہے۔ یہ تاثیر اور یہ انوار دنیا کی کسی کتاب میں نہیں۔ قرآن کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ یہ قیامت تک باقی رہے گا۔ کتنے لوگوں نے زور لگایا کہ یہ دنیا سے مٹ جائے یا اس میں کچھ تحریف و تبدیلی کر دی جائے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوائے نبوّت کر کے بیشمار معجزات دکھلائے۔ معراج کا واقعہ، درختوں کا کلام کرنا، انگلیوں سے پانی نکلنا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا، تھوڑا سا کھانا بہت سے لوگوں کو کافی ہونا، لکڑی کے ستون کا انسانوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا، مٹھی میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا وغیرہ، ساتھ ہی ساتھ آپ نے خلقِ خدا کو اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پہونچائے اور لوگوں کو ہدایت پیش کی۔ ہزاروں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا

سب پہلے نبی خاص کسی قوم، ملک یا مقام کے لئے آتے تھے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں اور جنّوں کے لئے اور تا قیامت ہر قوم اور ہر خطّہ زمین کے بسنے والوں کے لئے نبی بن کر آئے۔ پچھلے نبی دوسرے نبی کے آنے تک رہے۔ اوروں کی شریعتیں منسوخ ہوتی رہیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا اور نہ اب آپ کی شریعت منسوخ ہوگی۔ آپ پر نازل ہونے والا قرآن پچھلی کتب سماویہ اور انبیاء علیہ السلام کی تصدیق کرتا ہے اور سارے نبیوں پر ایمان لانے کو فرض قرار دیتا ہے اس طرح آپ کی نبوّت سب نبیوں کی نبوّت کو شامل اور ان سب میں افضل ہے

یہ بات بھی خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ جب نبی کو نبی مان لیا تو اس کی سب باتوں کی تصدیق کرنا اور ان کو سچا جاننا ایمانِ کامل اور عقلِ سلیم کا تقاضہ ہے۔ ان کو ماننے کا مطلب یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ خدا کا فرمایا ہوا ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ حق کہتے ہیں خواہ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ البتہ ان کی باتیں عقل میں آنے اور دل میں اُترنے والی ہوتی ہیں۔

عالمِ آخرت

اہلِ عقل کے نزدیک یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ خدا تعالیٰ انصاف کرنے والا ہے اس میں صفتِ عدل ہے۔ وہ ضرور انصاف کرے گا۔ مگر دنیا میں ہم ایسے صدہا لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بُرے کام کئے۔ بندگانِ خدا پر ظلم وستم کیا۔ تمام عمر عیاشی میں گذار دی۔ اور ان کو دنیا میں سزا نہ ہوئی۔ عقل کہتی ہے کہ ایک ایسا جہان ضرور ہونا چاہیئے جہاں ان ظالموں کو ان کے بُرے کام اور ظلم کی سزا ہو اور مظلوموں کو بدلہ اور نیک کام کرنیوالوں کو انعام ملے، ایسا جہان ماننا عقل کا عین منشاء اور صفتِ عدل کے عین مطابق ہے۔ اسی کو عالمِ آخرت کہتے ہیں۔

اس بات کو یوں سمجھو کہ ایک عادل ومنصف، رحیم وکریم بادشاہ کی شانِ حکومت اور شانِ عدل کا اقتضاء یہ ہے کہ اوّل اپنی رعایا کے لئے ایک قانون مرتّب کرے تاکہ لوگ اسکی پابندی کرکے کسی کی حق تلفی اور ایکدوسرے پر ظلم وتعدّی نہ کرسکیں پھر وہ عادل بادشاہ ایسی عدالتیں قائم کرے جہاں ظالم ومظلوم کا فیصلہ ہو سکے۔ مدعی اور مدعا علیہ کی سماعت کا وقت مقرر

ہونا چاہیئے تاکہ سب کے سامنے اس کا فیصلہ سنایا جائے۔ اور مجرم کو حوالۂ پولیس کیا جاسکے۔ تاکہ اُسے بیڑیاں، ہتھکڑیاں پہنا کر تھانے میں ڈالا جائے اور سزا جاری کی جائے۔ مظلوم کو بدلہ ملنا چاہیئے۔ ٹھیک اسی طرح احکم الحاکمین نے اپنے بندوں کے لئے انبیاء و مرسلین کی وساطت سے مختلف کتابیں اور صحیفے وقتاً فوقتاً نازل فرمائے۔ اور سب سے آخر میں خاتم الانبیاء والمرسلین سیّدالاولین والآخرین سیّدنا و مولانا محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نہایت جامع کامل اکمل شریعت آفتاب سے زیادہ روشن و واضح ہدایت و آخری پیغام دیکر بھیجا تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تابعداری کریں۔ اسکی ناراضی کے کاموں سے بچیں۔ حقوق العباد ادا کریں اور حقوق اللہ کی کوتاہی پر اس سے معافی مانگیں۔

انبیاء علیہم السلام نے آگاہ کر دیا کہ اللہ تعالےٰ نے ایک دن مقرر کر دیا ہے۔ اسی روز سب نیک و بد کا فیصلہ ہوگا۔ اسی دن سزا و جزا کے احکامات صادر ہوں گے۔ نیکوکاروں کو حساب وکتاب کے بعد جنّت میں اور بدکاروں کو جیل یعنی دوزخ میں بھیجا جائے گا۔

قیامت کا آنا برحق ہے

جو شے اجزاءِ مختلفہ سے مرکّب ہوتی ہے اس کے اجزا الگ الگ اغراض کے لئے ہوتے ہیں۔ جب وہ شے حدِ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اُسے پھوڑ کر الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کھیتی دو اہم اجزاء سے مرکّب ہے۔ ایک بھُس، دوسرے گندم، بھُس جانوروں کے کھانے اور دوسری اغراض

کے لئے ہے، اناج انسانوں کے کھانے کے لئے ہے۔ اس لئے کھیتی پک جانے کے بعد دونوں کو توڑ پھوڑ کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ اناج الگ، بھوسا الگ، ایسا کرنا عقلاً بھی ضروری ہے۔

اناج آٹے اور بھوسی سے مرکب ہے۔ پسے ہوئے گندم کو چھلنی سے چھان کر آٹا اور بھوسی علیحدہ کر دیتے ہیں۔ کوئی اہلِ عقل نہیں کہتا کہ ایسا کرنا عقل کے خلاف ہے۔ اس طرح پھل پک جانے کے بعد ان کا چھلکا اور مغز الگ کر لیتے ہیں۔ اس طرح انسان ہر چیز کو کام میں لانے سے قبل ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ روئی کا بنولوں سے الگ کرنا، کھانے کے لئے مصالحوں اور نمک کے ٹکڑے کرنا، کپڑا سینے کے لئے اس پر قینچی چلانا، لوہے کے پرزے بنانے کے لئے لوہے کے ریزے کرنا، تعمیر کے لئے پتھروں کو توڑنا، نئی عمارت بنانے کے لئے پرانی عمارت کو ڈھا دینا۔

یہ عالمِ کائنات بھی مختلف اجزاء سے مرکب ہے، دریا، پہاڑ زمین و آسمان، ہوا، سورج، رات، دن، گرمی، سردی، یہ سب عناصر مختلفہ ہیں۔ ان کو بھی توڑا پھوڑا جائے گا۔ پھر دوسرا عالم سامنے آئے گا قیامت عناصرِ مختلفہ کے ٹوٹنے پھوٹنے کا نام ہے۔ اور اس کے بعد جو عالم وجود میں آئے گا وہ عالمِ آخرت ہو گا۔

ہم روز مرّہ زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ کھیت ایک میدان ہوتا ہے، پھر جب کسان مناسب سمجھتا ہے اس کی آبپاشی کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے لہلہانے لگتا ہے۔ کچھ دن بعد وہ سوکھ جاتا ہے اور اسے کاٹ

لیا جاتا ہے۔ پھر پٹرہ پھیر کر میدان کر دیا جاتا ہے، یہ اس کھیت کی قیامتِ صغرٰی ہے۔

اسی طرح یہ عالم پہلے نہیں تھا۔ پیدا کرنے والے نے اُسے پیدا فرمایا۔ پھر وقتِ معیّن پر اس کو فنا کر دے گا۔ یہاں کی لہلہاہٹ سب ختم ہو جائے گی، یہ قیامتِ کبرٰی ہے۔ کھیت پر ہر سال قیامتِ صغرٰی آتی ہے اس پوری دنیا پر ایک قیامتِ کبرٰی آئے گی اور دنیا باقی نہ رہے گی۔

جس نے اس دنیا کو اس وقت پیدا کیا جب اس کا وجود نہ تھا۔ وہ فنا کرنے پر بھی قادر ہے۔ اور فنا کرنے کے بعد پھر پیدا کر دے گا۔ انسان کے لئے کسی چیز کو پہلی مرتبہ بنانا مشکل ہوتا ہے لیکن جب چیز بن جائے تو اسکو دوبارہ بنانا آسان ہوتا ہے۔ خدا کے لئے کیا مشکل ہے، جس کو پہلے پیدا کر دیا اسکو دوبارہ پیدا کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے تو دونوں مرتبہ پیدا کرنا یکساں آسان ہے۔ لہٰذا جتنے انسان دنیا میں آئیں گے سب مر جائیں گے۔ پھر ان کو اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا فرمائے گا۔ سب زندہ ہوں گے میدانِ حشر میں حساب کتاب ہوگا انصاف کی ترازو رکھی جائے گی۔ فرمانبرداروں کو انعامات سے نوازا جائیگا۔ اور جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ عیش و آرام کی زندگی گذارنے کے لئے جائیں گے۔ اس کا نام جنّت ہے اور جہاں نافرمانوں کو سزا ہوگی اس کا نام دوزخ ہے۔

اس کے علاوہ جن جن باتوں کی آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

نے خبر دی ہے، ان سب پر ایمان لانا اور یقین کرنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان پر زندہ رکھے، ایمان پر مارے اور ایمان پر ہی قیامت کے روز اٹھائے۔ آمین یا رب العالمین، بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم!

◎

انسان کے لئے معرفتِ حق کی راہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے۔ صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کائناتِ خلق پر نظر کرے۔ تفکر و تدبر کرے تو مصنوعات کا مطالعہ اُسے صانع تک پہنچا دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

ترجمہ: جو لوگ اللہ کی یاد کھڑے بیٹھے اور پہلو پر لیٹنے کے بعد (یعنی ہر حال میں) کرتے رہتے ہیں۔ اور غور و فکر کی قوت کو زمین و آسمان کی پیدائش میں لگاتے ہیں، اس راہ میں فکر انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے۔ کہ اسکی نظر مصنوعاتِ عالم کے جلووں میں محو ہو کر رہ گئیں۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی وہ ان پردوں کے نقش و نگار دیکھ کر بے خود ہو گیا مگر اسکی جستجو نہ کی کہ آخر کس نے اس دنیائے عالم پر یہ دل آویز پردے ڈالے ہیں۔ دنیا میں مظاہر فطرت کی پرستش اور انکارِ وجود باری کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی ہے۔ اس کوتاہ نظر نے آفتاب و ماہتاب کے انوار

دیکھے۔ لیکن کبھی یہ نہ سوچا کہ آخر اُن کو کس نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ انوار کس کی بخشش ہے۔ محض تدبّر و تفکّر کی کمی ہے ورنہ قلب پر کسی نے قفل نہیں ڈال دیئے ہیں۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ط

ترجمہ: پس کیا یہ لوگ قرآن میں تدبّر و تفکّر نہیں کرتے یا اُن کے قلوب پر تالے پڑ گئے ہیں، ورنہ وجود باری کی معرفت کے لئے قرآن نے ایک ایسی سیدھی سادی، جانی بوجھی شناخت بتلائی ہے۔ جس کا ادراک و یقین قدرتی طور پر انسان کے اندر موجود ہے اور بڑی سہل ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ سہل اور دلنشین ہوتی ہے۔ اور خود فطرت کا یہی حال ہے کہ وہ کسی گوشے میں اُلجھی ہوئی نہیں ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

اُلجھاؤ جس قدر پیدا ہوتا ہے بناوٹ اور تکلیف میں پیدا ہوتا ہے پس جو بات سچّی اور حقیقی ہو گی۔ ضروری ہے کہ سیدھی سادھی اور دلنشین بھی ہو گی دلنشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آجائے ذہن کو کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ ذہن اس طرح قبول کرے گویا پیشتر سے سمجھی

سوچی ہوئی بات تھی جیسا ایک شاعر نے کہا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا ٭ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قرآن کریم کا اسلوب بیان اسی طرح کا ہے کہ اُس سے زیادہ سہل اور دلنشین بیان کیا ہو سکتا ہے؟ اس جلوہ گاہِ عالم میں ان کے جلوے شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں اگرچہ یہ اپنی جہالت و غفلت سے ان میں غور و تفکر نہیں کرتا۔ قرآن تو بار بار دعوت دیتا ہے اور نصیحت کرتا ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

ترجمہ: ہم نے تو قرآن کو اپنی یاد آوری کیلئے آسان کر دیا ہے پس کیا ہے کوئی نصیحت لینے والا۔

دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا حال یہی ہے۔ جب سامنے نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل بات کوئی نہیں ہے۔ جب سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ سہل اور صاف بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہر کس نشناسندۂ راز است و اگر نہ

اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اس راز کا راز ہونا یہی ہے کہ پہچاننا اور جاننا نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ تو عوام کو بھی معلوم ہے دنیا میں جب کبھی وحی الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھا دیں کیونکہ خدا پرستی کے لئے اور اس کے بارے میں انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جا سکتی۔ اس وحی الٰہی کا کام یہی رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم و اعتراف کی ٹھیک

ٹھیک تدابیر بتادے چونکہ یہ تعبیر حقیقت حال کی سچی تعبیر ہوتی ہے اسلئے جب کبھی ایک انسان راستبازی کے ساتھ اُس پر غور کرے گا بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ اس کا ہر بول اس کے دل ودماغ کی قدرتی آواز ہے اور بیشک اے پروردگار اس کارخانۂ عالم کو تو نے بیکار پیدا نہیں کیا ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

کیا اُس نے اپنے وجود کی کوئی نشانی تم کو نہیں دی ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ پانی بکثرت ہے مگر پیاسا اس کی طرف رُخ نہیں کرتا۔ پھر قصور کس کا ہے۔ وہ تو کہتا ہے:۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ط وَكَذٰلِكَ لَكُمُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ،

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو اسی طرح اللہ تعالیٰ تمھارے لئے اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو۔

اور اپنے مخالفین سے بھی دلیل وبرہان کا مطالبہ کرتا ہے۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ اِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ بِهٰذَا اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

آپ ان سے کہہ دیں اپنے دعوے پر دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو اس دعوے پر تمھارے پاس کوئی دلیل نہیں یا پھر اللہ پر ایسی بات کہتے ہیں جس کا تمھیں علم نہیں۔

اچھا ایک طالب صادق اس راہ میں قدم اُٹھاتا ہے اور کائنات خلق کے مظاہر وآثار کا مطالعہ کرتا ہے تو سب سے پہلا اثر جو اس کے دل ودماغ پر

طاری ہوتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود کے باہر کی ہر چیز ایک صانع حکیم و مدبّر قدیر کی کار فرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ اور اُسی کی ربوبیت و رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرّۂ خلقت میں نظر آرہا ہے پس قدرتی طور سے اسکی روح محویتِ جمال سے معمور ہو جائے گی۔ وہ کہہ اُٹھے گا کہ یہ صرف صانع حقیقی کی صنعتوں کا ظہور ہے۔ اس مخلوق کے حسن وجمال، خوبی وکمال کی جتنی بھی مدحت سرائی ہو گی۔ وہ مصنوع کی نہیں بلکہ اُس کے صانع کی ہو گی۔

قرآن کریم نے اللہ جل شانہٗ کی سب سے پہلی صفت بیان کی ہے وہ صفتِ ربوبیت ہے، قرآن شریف کھولئے پہلے ورقے پر سورۂ فاتحہ ہے اسکی پہلی آیت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، اس سے معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لینے کی سیدھی اور صاف راہ یہ ہے کہ اُس کو اسکی صفات کے ذریعے پہچانا جائے قرآن شریف میں سب سے پہلی صفت رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ذکر کی گئی ہے۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہے اُسے چاہیئے کہ اسکی صفتِ ربوبیت میں غور کرے، جتنا وہ اس کے اندر تدبّر و تفکّر کرے گا اُسے رب تعالیٰ و تبارک کے وجود کا یقین کامل ہوتا چلا جائیگا۔

لغت میں ربوبیت کے معنیٰ "اُنشاء الشئی حالاً فحالاً الیٰ حدّ التّمام"، کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اسکی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشو ونما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حدِّ کمال تک پہنچ جائے۔ اگر کوئی شخص کسی بھوکے کو کھانا کھلائے گا تو یہ اسکی جود و سخاوت

کہلائے گی۔ احسان کرنا کہیں گے۔ لیکن ربوبیت کے لئے پرورش اور نگہداشت کا شفقت و رحمت کے ساتھ ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہونا اور اسکی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں ان سب کا سروسامان ہوتے رہنا ربوبیت ہے :

ربوبیت کا ایک ناقص نمونہ ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے۔ زندگی و نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے۔ سب کی سب تربیت و پرورش کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت، بخشش و امانت کا ایک طول و طویل سلسلہ ہے۔ اور اس کو اس وقت تک جاری رہنا چاہیئے۔ جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں۔ ان کی نوعیت بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش نگرانی کی نگاہ اور زندگانی کا سروسامان ملتا رہے۔ حکمتِ الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیئے ہیں۔ ماں بچے کو پیدائش کے دن سے پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اسکی ضروریات کا حسب حیثیت سروسامان مہیا کرتی ہے۔

مجازی ربوبیت کی یہ ناقص و محدود مثال سامنے لاؤ اور ربوبیتِ الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کرو، اس کے رب العالمین ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اسکی خالقیت نے کائنات ہستی اور اسکی ہر چیز کو پیدا

کیا ہے۔ اس طرح اسکی ربوبیت نے ہر وجود کو زندگی وبقاء کے لئے جو کچھ مطلوب تھا، ہمہ وقت اُسے اسکی طرف سے اس طرح مل رہا ہے کہ اس کی ہر حالت کی رعایت ہے ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔ ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں۔ مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں پرند ہوا میں اُڑ رہے ہیں پھول باغ میں کھل رہے ہیں ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت اللہ کے پاس سب کے لئے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو۔ اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے تو مخلوقات میں بے شمار ایسی قسمیں ملیں گی جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں جن کو ہم ان آنکھوں سے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ تاہم ربوبیتِ الٰہی جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسے جسیم اور انسان جیسے عقیل مخلوق کیلئے سامانِ پرورش مہیا کرتی ہے ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان حشرات وجراثیم کے لئے ان کی زندگی وبقاء کی ہر چیز مہیّا کرتی ہے اور یہ سب کچھ انسان کے وجود سے باہر کی چیزیں ہیں انسان اگر اپنے وجود کو دیکھے تو خود اسکی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ	ان لوگوں کے لئے جو یقین کرنے والے
وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ○	ہیں، زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی

کتنی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔

اچھا اب غور کیجئے۔ زندگی کے لئے پانی کی ضرورت ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ! — ہم نے پانی کے ذریعہ ہر چیز کو حیات بخشی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے ہر طرف وافر ذخیرے موجود ہیں لیکن زندہ رہنے کے لئے صرف اتنا ہی ضروری نہیں کہ پانی موجود ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص انتظام، ایک خاص ترتیب اور ایک خاص مقررہ انتظام کے ساتھ موجود ہو اس دُنیائے عالم میں پانی کے بننے، برسنے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا جاتا ہے یہی ربوبیت ہے۔ اس سے ربوبیت کے تمام اعمال کا تصوّر کرنا چاہیئے۔ اس میں رحمت ہے۔ محبّت ہے، نگہبانی ہے جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کیا اسکی یہ ربوبیت ہے کہ جب برسے تو ایک ایک قطرہ برسے اور بادل اسکو ہر گوشہ تک پہنچائے ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرے اور ایک خاص موسم میں برسائے پھر ایک ایک تشنہ ذرّے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیراب کرے۔ آخر یہ کون ہے جو قطراتِ باراں اور بادلوں کے ذریعہ حیات بخش طرح طرح کے پھول و پھل اُگا رہا ہے اور زمین کے نیچے میں پانی کے خزانے جمع کر رہا ہے۔ کہ جب ضرورت ہو کنواں کھود و اور پانی نکالو۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ — اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی اُتارا پھر اُسے زمین میں

وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝

ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں (کہ جس طرح برسایا تھا اسی طرح، واپس لے جائیں پھر دیکھو اس پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کردیئے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور ان ہی میں تم اپنی غذا حاصل کرتے ہو۔

اگر بے اندازے پانی برسا کرے تو طوفانِ نوح آ جائے اور اگر نہ برسے تو خشک سالی آجائے۔ چرند پرند مر جائیں مگر پہاڑوں پر ایک اندازے کے مطابق بارش ہو کر برف جم جاتی ہے جو سال بھر تک پگھل کر ایک اندازے سے بہتی رہتی ہے آفتاب تو کل برفانی چٹانوں پر ایک دم ہی طلوع ہوتا ہے۔ لہٰذا اُسے تو ایک دم ہی سب کو پگھلا دینا چاہیئے یہ سال بھر تک ایک اندازہ نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر بارش اور پانی ہی نہیں بلکہ کائنات کو جو کچھ بخشا گیا ہے وہ ایک خاص اندازے کے ساتھ ہی عطا کیا گیا ہے۔ وہ اندازہ صاحبِ حکمت علیم و قدیر کا ایک قانون ٹھہرایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۔

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم اسکو ایک خاص مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ — ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک خاص اندازے کیساتھ پیدا کی ہیں۔

بظاہر جو چیز خود بخود ہوتی ہے وہ بے ڈھنگی بے ترتیب، بے اندازے ہوتی ہے آپ نے خودرَو جنگلات کو ملاحظہ کیا ہوگا۔ خودرو گھاس کے جھاڑ جھنکاڑ میں چلے ہوں گے دریا کا ساحل خود بخود ٹوٹ جائے اس کا نقصان اس کی بے اندازگی کا خیال کرو اور پھر نہروں کے پانی کا ایک اندازہ سے چھوڑنا خیال میں لاؤ۔ سارا نظامِ عالم ایک سلیس نظام کے ماتحت چل رہا ہے آخر کوئی ہے جو اپنے قانون و اندازے کے ساتھ اس کو قائم کئے ہے یا بے ڈھنگا چل رہا ہے۔

یہ کیا بات ہے کہ صرف یہی نہیں کہ دنیا میں پانی موجود ہو بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضائے سما میں پانی کی چادریں بچھادیں پھر ہواؤں کے جھونکے اُنھیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل پر برسائیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ جب برسے ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے، اور زمین کی بالائی سطح پر ایک خاص مقدار میں ہے اور اُس زمین کے اندر ایک خاص مقدار میں نمی پیدا کرے اور ایک خاص مقدار میں پانی فلٹر ہوتا ہوا کنوئیں کی نہر میں آکر دریا بن جائے کہ جہاں سے چاہو کھود لو اور پانی نکال لو۔ جو پانی ہوا کے بغیر دو دن میں سڑ جاتا ہے وہ زمین کی تہ

یں سے کیا کچھ صاف شفاف نکلتا ہے۔

قُلْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ۔

آپ کہہ دیں اگر تمھارا یہ (کنویں اور برسنے کا پانی) زمین کے اندر اور نیچے دھنسا دیا جائے تو تمھارے لئے یہ شیریں پانی کون لائے گا؟

آخر یہ ترتیب و اندازہ خیال مبارک میں نہیں گزرا کہ پہلے پہاڑوں پر برف کے تودے جمتے رہیں، پھر موسم کی تبدیلی سے وہ پگھلیں پھر اُن کے پگھلنے سے پانی کے چشمے اُبلنے لگیں پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بنیں پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دور دور جاویں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کریں باقی ماندہ جہاں سے آیا پھر وہیں چلا جائے ایسا کیوں نہ ہوا کہ کسی نہ کسی طرح صاف پانی موجود ہوتا مگر ایسی ترتیب و انتظام کے ساتھ موجود نہ تھا۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ ترتیب و اندازہ، نظم و نسق اس لئے ہے۔ کہ اس عالم کائنات میں ربوبیتِ الٰہیہ کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضی یہی ہے کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو وہ رحمت تھی جس نے پانی پیدا کیا۔ مگر یہ ربوبیت ہے جو اُسے اس طرح کام میں لائی جس سے پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہو گئیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ

يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهٖ ۚ فَإِذَآ أَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۚ

یہ اللہ ہی کی ذات ہے، جو ہوائیں بھیجتا ہے پھر ہوائیں بادلوں کو لے جاتی ہیں پس وہ ان کو فضاء آسمانی میں پھیلا دیتا ہے۔ جس طرح بھی اسکی مشیت ہوتی ہے وہ ان بادلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو ان بادلوں میں سے مینہ برس رہا ہے پھر جن لوگوں کو بارش کی برکت ملنی ہوتی ہے مل چکتی ہے۔ تو اچانک وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

اچھا کسان زمین ہموار کر کے ہل پھاڑ کرنا اور اس میں بیج ڈال دیتا ہے اس کا اتنا ہی کام تھا اب یہ کس کا آسرا لگائے بیٹھا ہے پھر اس بے آسرا کے لئے ٹھنڈی ہوا بارش کا پیغام لاتی ہے تو کس قدر خوشی کا مقام ہوتا ہے آخر اس بے آسرے کا آسرا کون ہے جو اس کھیت کو سرسبزی و شادابی بخشے گا؟

وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ

آیا وہ کون ذات ہے جو بارش آنے سے قبل خوشخبری کی ہوا بھیجتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ۝

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے پھر اسی پانی سے رنگ رنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں

پھر ان کی نشو ونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہوگئیں اور تم دیکھتے ہو کہ ان پر (کچھ روز بعد) زردی چھاگئی پھر بالآخر خشک ہوکر چورا چورا ہوگئی بلاشبہ دانش مندوں کے لیے اس صورت حال میں بڑی ہی عبرت ہے۔

اگر کسان ہی کھیت اُگاتا ہے اور وہی کل مختار ہے تو نہ اُگنے پر رونا کیوں ہے؟ یہ شکایت کیسی کہ اس سال باغ میں پھل نہیں آئے کھیت دبٹ ہوگیا۔ آخر کس نے روک دیا آؤ ہم بتائیں آیا تم اُگاتے ہو یا اور کوئی ذات ہے جس کا دستِ قدرت ہی اُگاتا ہے۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ۔ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝

اللہ پاک کلام پاک میں فرماتا ہے:

"اچھا تم نے اس بات پر غور کیا کہ تم جو کاشتکاری کرتے ہو اُسے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اُسے چورا چورا کر دیں اور تم صرف یہ کہنے کے لیے رہ جاؤ۔ افسوس ہمیں تو اس کا تاوان ہی دینا پڑے گا بلکہ ہم تو اپنی تمام محنت ہی سے محروم ہوگئے اچھا تم نے کبھی یہ بات دیکھی یہ پانی جو تمھارے پینے میں آتا ہے اُسے کون برساتا ہے تم برساتے ہو یا

ہم برساتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اُسے کڑوا کر دیں (جیسا سمندر ہے)، پھر کیا اس نعمت کے لئے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار ہو۔

آپ فرمایئے ان بادلوں پر کسی انسان کی حکومت ہے کہ جب وہ چاہے اپنے کھیت اور باغ میں برسائے اور دوسرے کے باغ و کھیت میں نہ برسنے دے اگر نہیں تو پھر یہ بادل و باراں کس کے قبضۂ قدرت میں ہیں ان پر کس کی حکومت ہے وہی اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہیں اور ان ہی کی ربوبیت کار فرما ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝

"اے افرادِ نسلِ انسانی اللہ تعالیٰ نے جن نعمتوں سے تمھیں فیض یاب کیا ہے ان میں غور کرو کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمھیں زمین و آسمان سے رزق دے رہا ہے نہیں اس کے سوا کوئی ذات ایسی نہیں ہے"

اچھا جب بادلوں میں بجلی چمکتی اور کڑکتی ہے تو آپ کو ڈر بھی لگتا ہے کہ یہ کہیں میرے اوپر یا میرے کھیت میں نہ گر پڑے اور امید بھی ڈیرہ لگا لیتی ہے کہ اب بارش ہو گی آپ تو امید و بیم کے درمیان ہیں پھر یہ بارش کون برساتا ہے اور اس مردہ زمین کو کون پھر سے حیات بخشتا ہے۔ آپ کو خدائے تعالیٰ نے عقل دی ہے کبھی اس عقل سے اس بارے میں بھی کام لیا؟ کیا اس باری تعالیٰ کے وجود کی یہ نشانی آپ کی عقل کے ترازو میں باوزن نہیں ہے؟۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ،

"(اور دیکھو) اسکی حکمت و قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور اُمید دونوں حالتیں طاری ہو جاتی ہیں اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے بلاشبہ اس صورت حال میں ان لوگوں کے لئے جو عقل و دانش رکھتے ہیں (حکمت الٰہی) کی بڑی نشانیاں ہیں" حساب تو لکھا لکھایا موجود ہے۔ مگر اس وجہ سے کہ حساب لکھنے والے کو دیکھا نہیں ہے حساب لکھنے والے کا انکار کرنا خلافِ عقل و دانش ہے اس طرح ربوبیت کا نظام موجود ہے محض ربّ کے نہ دیکھ لینے کی وجہ سے رب کا انکار کرنا بھی خلاف عقل اور خلاف فہم سلیم ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ط

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تونے ✿ مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا

****